تحریک فیضان لوح و قلم: محمد ساجد رضا قادری رضوی

عزائم ہوں اگر محکم چراغ دل جلانے میں
تو مشکل کیا زمانے پر اجالا بن کے چھانے میں

سنبھل کے ممتاز مجاہدین آزادی

(ڈاکٹر سعادت علی صدیقی)

سابق صدر شعبۂ اردو
ایم. جی. ایم. ڈگری کالج. سنبھل

مرتب

ڈاکٹر محمد ریاض الاسلام حمیدی
ایم. اے. پی. ایچ. ڈی

نام کتاب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سنبھل کے ممتاز مجاہدین آزادی

مولف۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر محمد ریاض الاسلام حمیدی

مصنف۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر سعادت علی صدیقی مرحوم

ناشر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر محمد ریاض الاسلام حمیدی

اشاعت اول۔۔۔۔۔۔۔۔۴۰۰ سنہ ۲۰۱۰ء

کمپیوزنگ۔۔۔۔۔۔۔ نوید الحسن صابری

سرورق۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمد مستفیض نعیمی

صفحات۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۸۸

طباعت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایس ایف گرافکس لکھنؤ

قیمت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۱۵۰/روپیہ

ملنے کے پتے۔

اردو کتاب گھر، نخاسہ سنبھل۔

اردو گھر، تمرداس سرائے سنبھل۔

مسکن اردو، ہندو پورا کھیڑا دیپا سرائے سنبھل۔

انتساب

والدہ مرحومہ

کے نام

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

محمد ریاض الاسلام حمیدی

فہرست مضامین

☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆

☆

حرفِ آغاز

ایسٹ انڈیا کمپنی کے عیّار مکّار نمائندوں نے جب اپنی شاطرانہ چالوں اور پُر فریب ہتھ کنڈوں سے ہندوستان کو غلامی کے شکنجے میں جکڑلیا اور ہندوستانیوں بالخصوص آزادی کے متوالوں پر جبر وتشدّد کے پہاڑ توڑنا شروع کر دیئے تو سارے ملک میں اضطراب و بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ انگریزوں کے خلاف نفرت و غصّے کا لاوا پھوٹ پڑا۔ مادروطن کے سپوتوں میں آزادی وحریّت کا جذبہ بیدار ہونے لگا۔ وطن کے جیالے سپوت سر سے کفن باندھ کر گھروں سے نکل پڑے۔ بہادر شاہ ظفر، بیگم حضرت محل، جھانسی کی رانی، منگل پانڈے، نانا صاحب، تانتیا ٹوپے، احمد اللہ شاہ اور ان جیسے سینکڑوں فدائیان وطن کی قیادت میں انگریزوں سے لڑی جانے والی جنگ کی آگ ملک کے کونے کونے اور چپّہ چپّہ میں پھیل گئی۔

۱۵ر جون ۱۸۵۷ء کو مجاہدوں کے ایک گروہ نے تحصیل بلاری کو لوٹ لیا۔ سنبھل چندوسی میں بھی مجاہدوں کے ذریعہ لوٹ مار ہونے لگی۔ سنبھل کے مجاہدوں نے بھی علم بغاوت کو بلند رکھا اور انگریزوں کو یہاں سے بھگا دیا گیا۔ انگریز پٹھو نواب یوسف علی خان

والئی رامپور نے اپنی فوجیں سنبھل بھیجیں لیکن وہ بے اثر رہیں اور مجاہدوں نے انہیں یہاں رکنے نہیں دیا۔ اپریل ۱۸۵۸ء کو شہزادہ فیروز سنبھل آیا تو اس نے مجاہدوں کے جوش و خروش بڑھانے میں اہم رول ادا کیا منشی امام الدین، میاں جی شیخ ترک، منشی امیر حسن اور شیخ اجیا لے تحریک کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے تھے شہزادہ فیروز کے جانے کے بعد انگریزوں نے دوبارہ سنبھل مرادآباد پر اپنا تسلّط قائم کرلیا۔ منشی امام الدین ہادی اور میاں جی شیخ ترک، منشی امیر حسن کو گرفتار کرلیا اور پھانسی دے دی گئی۔ منشی امام الدین ہادی کی نعش کو چونے کی بھٹی میں جھونک دیا گیا۔

عظیم اللہ سنبھلی جو نانا صاحب کے بہت بڑے حامی و مددگار و اور تحریک آزادی کی مشہور شخصیت تھے کانپور کے خونی معرکے میں شکست کے بعد وہ گجرات کی طرف روانہ ہوئے مدتوں تک وہ اپنے قافلے کے ساتھ جنگلوں میں بھٹکتے رہے انھوں نے ملک کی آزادی کے لئے تن من دھن کی بازی لگادی انھیں گرفتار کرلیا گیا۔ راجہ نے انھیں جیل سے بلا کر انگریزوں کے کہنے پر گولی کا نشانہ بنایا اور جام شہادت نوش کیا۔

۱۹۲۰ء میں سودیشکا کا استعمال اور بدیشی کا بائیکاٹ تحریک نے انگریز حکومت کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہ تحریک پورے ملک میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ سنبھل کے مجاہدین نے انگریزوں کے خلاف بہت بڑا جلوس نکالا جس میں ساری غیر ملکی چیزوں کا ڈھیر لگا کر اس میں آگ لگادی گئی۔ ۱۹۴۲ء میں ہندوستان چھوڑو تحریک شروع ہوئی تو اس تحریک سے بھی سنبھل کے باشندے متاثر ہوئے اور وطن عزیز کو آزاد کرانے کیلئے ہر قربانی دینے کو تیار رہے انگریزوں کے ظلم سہتے رہے لیکن آزادی کے متوالوں نے اس کی پرواہ نہ کی۔ سنبھل کے آزادی کے متوالوں نے بھورے بھشتی جو انگریزوں کے مشابہ تھے کو

گدھے پر بٹھا کر جلوس کو پورے جوش وخروش کے ساتھ سارے شہر میں گھمایا مجاہدین انقلاب زندہ باد، انگریزوں ہندوستان چھوڑو کے نعرے لگا رہے تھے ساری فضا میں ان نعروں کی آواز گونج رہی تھی اس جلوس پر ڈی.ایم مرادآباد جو انگریز تھا فورس کو گولی چلانے کا حکم دیا جس میں تین مجاہد شہید ہو گئے۔

۱۸۵۷ء کی انقلابی تحریک سے لیکر ۱۹۴۲ء کی ہندوستان چھوڑو تحریک تک سنبھل کے مجاہدین نے ہر تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ملک کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے لئے ہر قربانی دے کر یہ ثابت کر دیا کہ سنبھل کے مجاہد ہندوستان کو آزاد کرانے میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ ہندوستان کے مجاہدین آزادی کے ساتھ ساتھ عظیم اللہ، سنبھلی منشی امام الدین ہادی، شیخ میاں جی ترک، منشی امیر حسن اور ان گنت مجاہدین کی شہادت رنگ لائی۔ انگریزوں کو ہندوستان چھوڑ کر جانا پڑا اور ہندوستان ۱۹۴۷ء کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہو گیا۔

غرض تحریکِ آزادی کے اولین دور سے لیکر ملک کے آزاد ہونے تک سنبھل کے مجاہدین کبھی کسی موڑ پر پیچھے نہیں رہے اور انگریزوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن افسوس کہ آزادی کے ان متوالوں کی نہ تو کوئی تاریخ لکھی گئی اور نہ ہی لوگ ان کے کارناموں اور مجاہدانہ سرگرمیوں سے واقف ہیں۔

ڈاکٹر سعادت علی صدیقی مرحوم کا ۱۹۷۱ء میں ایم.جی.ایم. ڈگری کالج سنبھل میں بحیثیت اردو لکچرر تقرر ہوا اور جب وہ سنبھل تشریف لائے تو ابتدا میں انہوں نے اس تاریخی بستی کا جائزہ لیا تو انھیں ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ہر جگہ سے علمی بو آ رہی ہے اور انھیں ایسا علمی خزینہ مل گیا جس کی انہیں تلاش تھی اور پھر وہ اس کی تلاش و جستجو میں لگ گئے۔

ڈاکٹر موصوف کی تقریباً ایک درجن کتابیں اسی سرزمین پر وجود میں آئیں ڈاکٹر سعادت علی صدیقی نے طالب علمی کے زمانے میں ہی قلم سنبھال لیا تھا اور آخر دم تک قلم انکے ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ تقریباً ۲۰ رسال کی عمر میں پہلی کتاب ''آئینہ نثر اردو'' منظر عام پر آئی اور متعدد صوبوں کی یونیورسیٹی کے نصاب میں داخل ہوئی

تذکرہ نگاری اور تعارف نگاری ان کی دلچسپی کا خاص موضوع تھا۔ اس کے لئے عموماً انھوں نے قصبات کے گم نام اور غیر معروف شاعروں، ادیبوں علماء مجاہدین آزادی، سیاسی وسماجی رہنماؤں اور فن کاروں کو موضوع بنایا اور انہیں گم نامی سے نکال کر علمی وادبی دنیا کے سامنے پیش کیا۔ سنبھل خصوصی طور پر ان کی توجہ کا مرکز رہا۔ انھوں نے سنبھل سے متعلق چھ تذکرے تصنیف کئے کچھ شائع ہوئے کچھ اشاعت کے انتظار میں ہیں۔

جب راقم الحروف نے ڈاکٹر سعادت علی صدیقی مرحوم کی حیات اور علمی خدمات پر تحقیقی کام کا ارادہ کیا اور استاذ محترم مخدومی ڈاکٹر نواب حسین خان نظامی کے سامنے اس ارادے کا اظہار کیا تو انھوں نے بخوشی اس کی تائید فرمائی اور ان کی حوصلہ افزائی کے سہارے میں نے کام کا آغاز کر دیا تحقیق کے دوران جب ڈاکٹر سعادت علی صدیقی مرحوم کی حیات اور علمی وادبی خدمات کے متعلق مواد جمع کیا تو اس وقت ان کی ۱۶ رکتابیں شائع ہو چکی تھیں ۔ اس کے علاوہ کچھ مسوّدے غیر مطبوعہ نا مکمل دستیاب ہوئے ۔ ۲۰۰۳ء میں روہیل کھنڈ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہونے کے بعد ۲۰۰۸ء میں ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کی علمی اور ادبی خدمات پر مبنی تحقیقی مقالہ منظر عام پر آیا۔ ۱۵ر مارچ ۲۰۰۹ء کو سنبھل میں ''یوم سعادت'' کے موقع پر ہند انٹر کالج سنبھل کے وسیع میدان میں اجرا عمل میں آیا جس میں شہر و بیرون شہر کی اردو ہندی کی نامور ہستیوں نے شرکت کی۔ جس

میں ڈاکٹر اوصاف احمد، ڈاکٹر خوشحال زیدی، محترم احمد ابراہیم علوی، مدیر اعلیٰ " آگ" محترم ظفر علی نقوی (چیئر مین اقلیتی کمیشن) محترم شفاعت علی صدیقی (اردو پروڈیوسر لکھنؤ)، ڈاکٹر پروین شجاعت ، ڈاکٹر ڈی این شرما، محترم عتیق احمد (ڈائریکٹر) وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں کتاب کی بہت پذیرائی ہوئی جس سے راقم کو حوصلہ ملا اسی موقع پر مختلف شعبہ میں کارہائے نمایاں انجام دینے والے حضرات کو ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کے نام پر " آفتاب سعادت ایوارڈ "۲۰۰۹ سے بھی نوازا گیا۔

۱۹۹۰ء میں سنبھل کے چند اکابر علماء و مجاہدین آزادی نام سے ایک تذکرہ منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد ان کی تلاش و جستجو جاری رہی اس تلاش و جستجو کے کے نتیجہ میں اتنا مواد جمع ہو گیا کہ علماء اور مجاہدین آزادی کے دو الگ الگ تذکرے وجود میں آگئے۔ لیکن دونوں ہی اشاعت سے محروم رہے۔ سنبھل کے ممتاز مجاہدین آزادی کا مسودہ ڈاکٹر سعادت علی صدیقی مرحوم نے اتر پردیش اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام شائع کرانے کے لئے ۱۹۹۲ء میں اکاڈمی میں جمع کر دیا۔ ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کے انتقال کے بعد محترم شفاعت علی صدیقی اور راقم نے اردو اکاڈمی میں مسودے کے سلسلے میں عبدالرب صاحب اور اکاڈمی کے عہدے داران سے رابطہ قائم کیا نتیجہ صفر نکلا مسودہ وہاں سے ضائع ہو گیا۔ بہت تگ و دو کے بعد اخبارات و رسائل اور ڈاکٹر سعادت علی صدیقی مرحوم کی فائلوں میں دستیاب مضامین کو از سر نو ترتیب دے کر " سنبھل کے ممتاز مجاہدین آزادی" کے نام سے ہی شائع کیا جا رہا ہے۔

بہت محنت کرنے کے بعد سنبھل کے تقریباً چار درجن مجاہدین کے نام دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں کچھ مجاہدین کا تو ذکر ملتا ہے اور کچھ پر بہت کم معلومات حاصل ہو سکی

ہے۔اس کے علاوہ "اتر پردیش کے سوتنتر تا سنگرام سینانی" میں کتاب میں سنبھل کے جن مجاہدین کا تذکرہ ہے ان کو بھی کتاب میں شامل کرلیا گیا ہے ۔

سنبھل کے جن مجاہدین آزادی کے نام کتابوں یا لوگوں کی زبانی دریافت ہوئے ہیں ان میں عظیم اللہ سنبھلی، منشی امام الدین ہادی مفتی عبدالسلام، مولانا مبارک حسین محمودی، قاری عبدالحق ترینوی، پنڈت جے نرائن شرما، مولانا اسمٰعیل، مہاشیے پیارے لال، منشی معین الدین، مولوی عبدالوحید، مولانا عبید اللہ، ادے پال گپتا، حافظ نورالحسن، چیتن سروپ رستوگی، مولوی سلطان احمد، مولانا عبدالقیوم، چودھری محمد ریاست علی ، شیخ میاں جی ترک، منشی امیر حسن، لالہ چندولال۔ لالہ پریم پال ماسٹر روپ کشور، رگھوناتھ تیاگی، رادھے لال، انگل لال، عبدالسلام، عبدالرحمان، علی بخش، علی حسین، امام بخش، نذار حسین، بدرالدین ،مقصود احمد، محمد بخش، عبدالرحیم، امرت لال، اونکار سرن کیول پرکاش، کیلاش دیو، گنگا جاٹو، چھجو سنگھ، چھٹن سنگھ، لالہ واسودیو، مولانا غلام رسول، ظہورالدین، شیو چند آریہ، لالہ نروتم داس، شیخ اجیالے وغیرہ شامل ہیں۔

کتاب میں حرف آغاز اور تعارف کے بعد ''سنبھل کی مختصر تاریخ'' ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کے سنبھل کی تاریخ پر مختصر مضمون ہے۔ جس میں سنبھل کی تاریخی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس کے بعد'' جنگ آزادی میں سنبھل کا حصّہ'' کے حوالے سے ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کا ایک طویل مضمون جو اضافہ کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ جس میں سنبھل اور نواحی بستیوں کے مجاہدین کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس کے بعد جن مجاہدین آزادی کے حالات اور کارنامے تفصیل سے دستیاب ہوئے ہیں ان میں شیخ امام الدین ہادی، مفتی عبدالسلام، مولانا مبارک حسین محمودی، قاری عبدالحق ترینوی، پنڈت جے نرائن

شرما،مولانا اسمٰعیل،مہاشیے پیارے لال، منشی معین الدین ،مولوی عبدالوحید،مولانا عبیداللہ ، چودھری محمد ریاست علی، ادے پال گپتا ، حافظ نورالحسن ، چیتن سروپ رستوگی ، مولوی سلطان احمد،مولانا عبدالقیوم وغیرہ کوشامل کیا گیا ہے۔

میں ان تمام حضرات کاشکر یہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ جنھوں نے میری ہر ممکن امداد و معاونت کی خصوصاً محترم شفاعت علی صدیقی ،محترمہ سلمٰی خاتون ، استاذ محترم وقار رومانی ،محترم مینک ماتھر،محترم ڈاکٹر اوصاف احمد ،محترم احمد ابرہیم علوی ، ڈاکٹر پروین شجاعت ،محترم ڈاکٹر دیوکی نندن شرما،محترم ڈاکٹر رام ناتھ پاٹھک ،محترم ڈاکٹر مسلم شبنم نوری ،محترم چاندمیاں خاں وغیرہ نے ہرطرح کی اعانت کی ، مخلص احباب محترم سہیل صدیقی برادرمکرم محترم محمد سعد عثمانی ،محترم فیصل وقار،محترم اویس سنبھلی۔ محمد مستفیض نعیمی محمد تنزیل احمد (لائبریرین) محترم اکبرعلی بیگ ،محترم افسر علی ،محترم ریحان الحق ،محترم نعمان جلیل ، محترم جاوید شفیق ،محترم آفتاب عالم ،محترم مشاہد حسین ،محترم نسیم اختر،محترم سکھ ویرسنگھ ،محترم محمد عاقل ،محترم محمد اطہر خاں ،محترم ظفر ملک کا بے حد ممنون ومشکور ہوں ، جو ہر قدم پر میرا حوصلہ بڑھاتے رہے ۔ نویدالحسن صابری ،محمد بدرالاسلام (علیگ) ندیم الاسلام ،ہمیر احمد نے کمپوزنگ سے لیکر طباعت تک کے تمام مراحل کو آسان کردیا۔ ان کے لئے دل سے دعا گو ہوں کہ ان کا ہر پل ان کے لئے خوشی لیکر آئے ۔ برائے کرم اہل علم اور دانش ور حضرات نقائص اور اغلاط کی نشاندہی فرمائیں اور مزید معلومات (جو جگہ پانے سے رہ گئی ہیں) فراہم کرانے کی زحمت فرمائیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں تصحیح اور اضافہ کیا جاسکے۔

ڈاکٹر ریاض حمیدی

تعارف

اتر پردیش کے ضلع مرادآباد کا قدیم ترین قصبہ سنبھل عہد قدیم میں ممتاز و منفرد حیثیت کا حامل رہا ہے سنبھل کو پرتھوی راج چوہان اور سات مسلم سلاطین کے عہد میں راجدھانی ہونے کا فخر رہا ہے۔ سنبھل کو سرکار سنبھل'' اور حویلی'' کے خطاب سے بھی نوازا گیا ہندو مذہب کی مقدس کتابوں میں بھی اس کا تذکرہ ملتا ہے۔

سنبھل تاریخی و سماجی اہمیت کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی حیثیت سے بھی اہم ترین مراکز میں شمار کیا جاتا رہا ہے۔ تاریخ کے اوراق کی گردانی کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دسویں صدی ہجری میں شیخ حاتمؒ نے ایک مدرسہ قائم کیا تھا ۔جس میں دور دراز سے طلبہ علم کی پیاس بجھانے آتے تھے اکبر کے عہد کے مشہور مورّخ عبدالقادر بدایونی بھی اسی مدرسہ

کے تعلیم یافتہ تھے سنبھل کے اکابر علماء ہر عہد میں علم وادب کی پیش بہا خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ان میں شیخ عزیز اللہ تنبلیؒ شیخ عجائب سنبھلیؒ، شیخ حمید الدین مفسرؒ سنبھلی، شیخ عثمان شاہ بنگالیؒ، شیخ ہلالیؒ، شاہ مراداللہؒ (مصنف تفسیر مرادیہ) شاہ ثناءاللہؒ، مفتی عبدالسلام، مفتی ابو ذروارثی، مفتیا جمل شاہ ،مولانا خلیل احمد اسرائیلی، مولانا کریم بخش، مفتی ولایت احمد مولانا ،منظور احمد نعمانی عبدالمقتدر، مولانا محفوظ سنبھلی، مولانا محمد حسن، مولانا برہان الدین، مولانا عتیق الرحمن نعمانی، وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

سنبھل میں شعر وادب کی روایت بھی بہت پرانی ہے یہاں کے ادباء شعرا نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ ادب کے دامن کو مالا مال کیا ہے اور ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ پروفیسر عندلیب شادانی، پروفیسر شبیر علی کاظمی، غلام احمد شوق فریدی، محمود اسرائیلی۔ باغ سنبھلی، مصور سبزواری، بہار حسین بہار، میر حسن دوست، رام جی مل کپور سنبھلی، ناظم عزیزی ،عبدالغفور سنبھلی، معجز سنبھلی طور سنبھلی، بخار علیگ، حکیم ظل الرحمن، وقار رومانی، مچھر فخری، محمد نعمان رہبر، رضوان مسرور، حسین افسر، ڈاکٹر طاہر رزاقی، کیفی سنبھلی، جلال افسر سنبھلی، وغیرہ کے نام شعر وادب کی تاریخ میں اہمیت کے حامل ہیں۔

ڈاکٹر سعادت علی صدیقی مرحوم کا نام علمی اور ادبی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں اہل علم ہی نہیں بلکہ اردو داں طبقہ بھی کسی نہ کسی طرح سے ان کے کارناموں سے واقف ہے۔ڈاکٹر سعادت علی صدیقی مرحوم کی پیدائش لکھنو کے ایک علمی وادبی خانوادے میں ہوئی ان کی تعلیم وتربیت ان کے والد ماجد ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی اور عم محترم شفاعت علی صدیقی کے زیر سایہ ہوئی۔انھوں نے زمانہ طالب علمی سے تقریباً ۱۵؍سال کی عمر میں قلم سنبھال لیا تھا۔ان کا قلم ہر حال اور ہر وقت رواں دواں رہا اور اپنے جو ہر دکھاتا رہا

۔جن لوگوں کو ان سے ملاقات اور قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو وہ جانتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم ہمیشہ پڑھنے لکھنے میں مصروف رہتے تھے ڈاکٹر سعادت علی صدیقی مرحوم نے ۴۹ رسال کی مختصر عمر میں جتنا کام کیا اور جتنا تحریری سرمایہ یادگا چھوڑا ہے اور اردو کی جو خدمات انجام دیں وہ قابل فخر اور قابل رشک ہیں ۴۹ رسال کی مختصر مدت میں ۳۲ رکتابوں کی ایک طویل فہرست ہے جن میں آئینہ نثر اردو'' شرح ادب پارے'' (نثر) بچوں کی لوک کہانیاں'' حبیبہ غالب'' ادبی جائزے'' وہ جب یاد آئے'' حدیث محبت'' ادبی آئینے'' چند ممتاز شعرائے سنبھل'' ادبی تحریریں'' غالب پر چند تحریریں'' اردو کا زندانی ادب''سنبھل کے چند اکابر علماء و مجاہدین آزادی'' چاند میں خرگوش'' ادبی تنویریں'' اردو کا دھرم نرپیکش سروپ'' انتخاب کلام قمر مرادآبادی'' وغیرہ منظر عام پر آچکی ہیں۔

ڈاکٹر سعادت علی صدیقی مرحوم کے تحقیقی مقالہ کا عنوان "اردو کا زندانی ادب" تھا ۔اسی کی تیاری کے وقت ان کی یہ تمنا رہی کہ وہ سنبھل کے گم نام اور غیر معروف مجاہدین کی کارکردگیوں اور قربانیوں کو منظر عام پر لائیں ۔اس کام کے لئے انھیں بڑی دقت اٹھانی پڑی مختلف مجاہدین آزادی کے حالات اور کارنامے نامکمل ہی حاصل ہوسکے بیشتر مجاہدین آزادی اپنی قربانیوں کی داستان اس زمین میں اپنے ساتھ لے گئے۔

اس مختصر کتاب میں سنبھل کے مجاہدین آزادی کو عزّت اور توقیر کے ساتھ یاد کیا گیا ہے اس میں منشی امام الدین ہادی جیسے لوگ بھی ہیں جو ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کی مشعل کو لے کر چلے ۔تو اس نسل کے مجاہدین آزادی بھی ہیں جنھوں نے اپنے بزرگوں اور اپنی قربانیوں اور ملک کی آزادی کی تحریک کو کامیاب ہوتے ہوئے دیکھا۔ ان میں سے مختلف کو حکومت ہند نے تامر پتر اور پنشن سے بھی نوازا۔

ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کے سنبھل کے ممتاز مجاہدین آزادی کے بکھرے ہوئے اوراق کو مختلف اخبارات ورسائل سے جمع کر کے ڈاکٹر محمد ریاض الاسلام نے کتابی شکل میں لانے کا جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ ڈاکٹر محمد ریاض الاسلام نے راقم کی نگرانی میں جو تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔ وہ بہت معیاری اور قابل تعریف ہے جس کو دوسری یونیورسٹیوں میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اور بہت پذیرائی ہوئی۔ اس لئے یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ڈاکٹر محمد ریاض الاسلام ان شاگردوں میں ہیں جن پر کسی بھی استاذ کو ناز ہو سکتا ہے۔ ایسے شاگرد نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔

ڈاکٹر محمد ریاض الاسلام کی یہ کاوش سنبھل کے مجاہدین آزادی اور ڈاکٹر سعادت علی صدیقی مرحوم کو ایک بہترین خراج عقیدت ہے۔

ڈاکٹر نواب حسین خاں نظامی
سابق ریڈر بریلی کالج، بریلی

تاریخی شہر سنبھل کی مختصر تاریخ

(ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کے مضمون کا خلاصہ)

مرادآباد سے تقریباً ۳۵ رکلومیٹر کے فاصلے پر آباد قدیمی شہر قصبہ سنبھل عہد قدیم میں منفرد وممتاز حیثیت کا حامل رہا ہے۔ یہ قصبہ دور ماضی میں ''سنبھلا گرام'' کے نام سے مشہور تھا اور جسے ست یگ میں ''بان'' تریتا میں ''مہد گری'' دواپر میں ''پنگل'' اور کلجگ میں ''سنبھل'' کہا گیا پرتھوی راج چوہان کے نانا راجہ حجات نے بسایا تھا۔ جسے پرتھوی راج کی راجدھانی ہونے کا فخر حاصل ہوا اور سات مسلم سلاطین کے عہد حکومت میں بھی یہی حیثیت برقرار رہی۔ سنبھل کو ''سرکار سنبھل'' اور ''حویلی'' کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔

مقامی مورخ اور مصنف غلام احمد شوق فریدی نے اپنی کتاب ''احسن التواریخ'' (سنبھل کی تاریخ ۳۶-۱۹۳۵) میں لکھا ہے۔

''سات مسلم سلاطین کے عہد حکومت میں راجدھانی ہونے کا فخر حاصل رہا ہے۔
اس سے پہلے پرتھوی راج چوہان نے بھی اس شہر کو راجدھانی بنایا تھا''۔
مشہور و معروف تاریخی کتاب ''تاریخ فرشتہ'' کے مصنف کے مطابق۔
'' اکبر کے عہد حکومت میں سرکار سنبھل کی تقسیم چالس پرگنوں پر تھی جس کا رقبہ ۴۰۹۰۹۹۳ بیگھ اور دو بسواں تھا اور مال گزاری ۶۹۹۴۰۴۹۱ دام نقد تھی ''

بحیثیت تاریخی شہر کے سنبھل کا ممتاز مقام ہے ہندو پرانوں اور عہد وسطیٰ کی تاریخی کتابوں ''تاریخ فیروز شاہی''،''تاریخ مبارک شاہی'' تاریخ داؤدی'' تاریخ شاہی'' گلشن ابراہیمی'' آئینہ اکبری'' اور منتخب التواریخ'' بابر نامہ'' تاریخ شیر شاہی''،''اقبال نامہ جہاں گیری''،''چہار گلشن'' وغیرہ میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ ۷۰۰ء میں بھارت کا یہ قدیم مقدس مقام تومر خاندان کی حکومت میں رہا۔ ۱۱۵۰ء میں پرتھوی راج چوہان کے دور حکومت میں سنبھل کو خاص اہمیت حاصل ہوئی۔ ۱۴۹۹ء میں سکندر لودھی نے اپنے دور حکومت میں سنبھل کو دارالسلطنت بنایا۔ ۱۵۰۴ء میں آگرے کی بنیاد پڑنے تک سنبھل کو یہ خاص درجہ حاصل رہا۔ اس دوران سنبھل ایک علمی اور تہذیبی مرکز کی حیثیت سے جلوہ گر ہوا۔

مغلیہ دور حکومت کے سنہری عہد میں اس کی اہمیت اپنے عروج پر پہونچ گئی۔ ہمایوں، عسکری، عیسیٰ خاں جیسے لوگ یہاں کے حکمران بنے۔ ۱۶۲۴ء میں یہاں کے گورنر مقرب حسین عرف رستم خاں نے مراد آباد کی بنیاد رکھی۔ لیکن سنبھل کی اہمیت بدستور قائم رہی۔

برطانوی عہد حکومت میں سنبھل کا زوال شروع ہو گیا عظمت پارینہ گھٹنے لگی علوم و فنون کو زمانے کی نظر کھا گئی۔ شوق فریدی لکھتے ہیں۔

خدا کی شان آج وہی عظیم الشان شہر جو اقطاع حکومت ہند میں ایک زبردست دارالسلطنت و راجدھانی ہونے کا فخر حاصل کئے بہ اعتبار قدامت و شوکت تمام ہندوستان کا مایۂ ناز تھا۔ اور بعد میں ہندی راجاؤں کے حکومت کے خاتمے پر مسلم سلاطین کے دور حکومت و فرمان روائی میں ایک معزز خطاب ولقب ''سرکار'' سے پکارا جاتا تھا۔ اور کبھی لفظ ''حویلی'' ہونے کا فخر اس کو حاصل تھا لیکن وہ اپنے منصب قدیمی اور پایۂ اصلی و ذاتی سے گرتے گرتے اور مٹتے مٹتے بھی دور حکومت برطانیہ میں پرگنہ کی صورت میں باقی رہ گیا ہے''۔

سنبھل کو اس کی قدامت و تاریخی اہمیت کو دیکھتے ہوئے بھارت کا روم کہا جاسکتا ہے ۔یہاں کے گرتے ہوئے حیرت انگیز بڑے بڑے کھنڈر اور شان و شوکت سے ٹوٹتے ہوئے قدیمی آثار اس شہر کے لوگوں کی انتہائی بہادری کے بے مثال جذبہ کی علامات ہیں۔ دور حاضر میں سنبھل مقدس شہر کی وجہ سے جانا جاتا ہے اہل ہنود کے یقین اور ان کی مذہبی کتابوں اور انکے عقائد کے مطابق یہ تیرتھ مقام اور مقدس شہر ہے۔ جہاں کلجگ کے بڑے اوتار پیدا ہوں گے۔ آج بھی اس شہر میں ۳۶ پورہ، ۵۲ سرائے، ۱۹ کوپ، ۶۸ تیرتھ ایک بڑا قلعہ اور قدیمی عمارتیں ہیں۔

تقریباً ۵۰۰ رسال پہلے سنبھل تعلیمی میدان میں ایک اہم مقام رکھتا تھا۔ یہاں ایک مدرسہ شیخ حاتمؒ نے قائم کیا تھا جس میں دور و دراز سے طلبہ تعلیم کے حصول کے لئے آتے تھے۔ مشہور مورخ ملاؔ عبدالقادر بدایونی نے اسی مدرسہ سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اس مدرسے نے تعلیمی دنیا میں خاص کر مذہبی نقطۂ نظر سے اہم رول ادا کیا اور سینکڑوں علماء پیدا کئے جنھوں نے بیش بہا خدمات انجام دیں۔

سنبھل تاریخی وسماجی اہمیت کے ساتھ ساتھ علمی وادبی حیثیت سے بھی اہم ترین مراکز میں شمار کیا جاتا رہا۔ یہاں ہر زمانے میں ایک سے ایک بڑھ کر شاعر ادباء اور فن کار پیدا ہوئے جنھوں نے ادب کا دامن مالا مال کیا۔

جنگ آزادی میں بھی سنبھل کے مجاہدین نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں سنبھل کے منشی امام الدین ہادی کو پھانسی کی سزا دے کر ان کی نعش کو چونے کی بھٹی میں پھونک دیا گیا۔ ان کے دوسرے ساتھیوں کو اذیتیں دی گئیں اور انہیں گولی کا نشانہ بنا گیا گیا۔ منشی جی اور ان کے ساتھیوں نے اپنے خون سے آزادی کی جو شمع روشن کی تھی وہ آزادی حاصل ہونے تک جلتی رہی ۔ ملک کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے لئے یہاں کے سیکڑوں لوگوں نے جان و مال کی قربانیاں دیں اور تحریک آزادی کے کارواں کو آگے بڑھایا۔

تہذیبی، صنعتی اور سماجی نظریہ سے بھی سنبھل کا ایک اہم مقام ہے فرقہ وارانہ ہم آہنگی قومی یک جہتی ، صنعتی ، اور تہذیبی اہمیت رکھنے والے یہاں کے تیوہار و میلے خاص اہمیت کے حامل ہیں ۔ ہولی کے بعد دوسرے منگل کو شہباز پور میں اور بدھ کو شہر میں لگنے والا میلہ ''نیزہ''عظیم الشان میلہ ہوتا ہے ۔ اس میلے کے لئے جھنڈوں میں استعمال ہونے والا ہزاروں میٹر کپڑا ، پکوانوں کے لئے لال شکر کی تیاری ، چھوٹی چھوٹی صنعتوں کی ریڈھ کی ہڈی ہیں ۔ میلے میں بکنے والے پلنگ کے پایہ لکڑی و مٹی کے کھلونے اور دیگر سامان چھوٹی صنعتوں کی ترقی کا ذریعہ ہیں شہر کے مختلف محلّوں میں خاص کر کوٹ غربی کے گھروں میں پورے سال کے دوران نئی دلہنوں کو پھر سے نیزہ دلہن بنا کر بٹھایا جاتا ہے ۔ عورتیں جن کو دیکھ کر سب سے اچھی دلہن کا زبانی انتخاب کرتی ہیں ۔ میلے کی مختلف رسم وروایات ہیں جن

میں خاص کر دھوبی برادری کی شادی، مہمانوں کی خاطر تواضع کھان پان دیکھنے کے قابل ہو
تے ہیں۔

پورا شہر بمثل میلہ ہو جاتا ہے۔ ہزاروں لوگ میلے کو تیوہار کی طرح مناتے ہیں ۔
اس موقع پر دور دراز سے لوگ آتے ہیں اور چہل پہل کرتے ہیں۔ اس طرح یہ میلہ صنعتی۔
تہذیبی، سماجی کارناموں کی عجیب تاریخ ہے۔ سبھی مذاہب و فرقہ کے لوگ اس میں شامل
ہوتے ہیں اسی طرح آپس میں میل جول پیدا ہوتا ہے۔

تحریک آزادی میں سنبھل کا حصّہ

روہیل کھنڈ جیسے تاریخ ساز خطے کے ضلع مرادآباد سے ۳۵ رکلومیٹر کے فاصلے پر آباد قدیم ترین قصبہ سنبھل عہد قدیم میں منفرد و ممتاز اہمیت کا حامل رہا ہے۔ مسلم سلاطین کے عہد حکومت میں تو اسے مرکزی مقام حاصل تھا۔ ہندوستان کی قدیم تاریخ میں بھی اس کا ذکر فخر و مباہات کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ پرتھوی راج چوہان کے نانا راجہ حجّات جب کوڑھ کے مرض میں مبتلا ہوا تو اس نے اسی علاقے میں آکر غسل کیا اور صحت یاب ہوا۔ اس وقت اس کی حیثیت بیابان کی تھی راجہ نے واقف کار بزرگوں سے اس خطّہ کا نام پوچھا تو انھوں نے جواب دیا ''سنبھلا گرام'' راجہ حجّات جو سرتھل کا ساکن تھا اسے آباد کرنے کا فیصلہ کیا اور یہاں ایک قلعہ کی تعمیر کی۔ اس نے سنبھل کو ۳۶ پورہ اور ۱۸۴ محلّوں پر بسایا تھا جس کا رقبہ ۳۶ رکوس تھا۔ ایک اور روایات کے مطابق ''سنبھلا گرام'' مختلف یگوں میں مختلف ناموں سے آباد رہا ہے ست یگ میں ''بان'' ترتیا میں ''عہد گری'' دواپر میں ''پنگل'' اور کلجگ میں ''سنبھل'' کے نام سے اس کا تذکرہ ملتا ہے۔

پرتھوی راج چوہان کے زمانے میں سنبھل کو راجدھانی ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ مسلم سلاطین کے عہد میں بھی اس کی یہ حیثیت برقرار رہی۔ مشہور مورّخ فرشتہ کے مطابق اکبر کے عہد میں سنبھل کی تقسیم چالیس پرگنوں پر تھی، احسن التواریخ (سنبھل کی تاریخ) کے مصنف غلام احمد شوقؔ فریدی سنبھل کی تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''یہ قدیم شہر جو آج قدیمی شان و شوکت عظمت و جلالت کے مٹنے پر بھی اپنے قدیمی آثار اور شکستہ و ریختہ در و دیوار کے باوجود متواتر انقلابات دہر اور ادوار کے ہر قسم کے ارباب فن و کمال کا مرکز بنا ہوا''

برطانوی عہد حکومت میں سنبھل کا زوال شروع ہو گیا۔ علوم و فنون کو زمانے کی نظر کھا گئی۔ سنبھل علمی و ادبی حیثیت سے بھی اہم مراکز میں شمار کیا جاتا تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ دور دراز کے تشنگان علم یہاں آتے اور اپنی پیاس سے بجھاتے تھے دسویں صدی ہجری میں یہاں ایک ایسا مدرسہ قائم ہوا تھا اس زمانے میں شیخ حاتم ؒ کے اس مدرسے کو مرکزی اور عالم گیر شہرت حاصل کی اور مدرسہ میں جید عالموں اور بزرگوں نے علم و آگہی کی وہ شمع روشن کی جس کا اجالا دور دور تک پھیلا اور یہ خطّہ صدیوں تک سرچشمہ علوم و فنون بنا رہا۔ کہتے ہیں کہ مشہور مورّخ ملاّ عبدالقادر بدایونی نے بھی اسی مدرسہ سے فیض اٹھایا۔ اس مدرسہ میں درس حاصل کرنے والے طالب علم وحید وعصر و یکتائے زمن کہلائے۔ جن کے کارناموں اور کارکردگیوں سے کتابوں کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ ادبی تہذیبی اور صنعتی میدان میں سنبھل قابل فخر مقام حاصل کئے ہوئے ہے۔ حب الوطنی قومی جذبہ اور قومی سطح کے مسائل سے ہمیشہ بیدار رہا ہے اور اپنے فرائض کو انجام دینے میں ہمیشہ پیش پیش رہا ہے۔ چنانچہ جب جب ہم تحریک آزادی

کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو اس نتیجہ پہ پہونچتے ہیں کہ حصول آزادی کے لئے شروع کی گئی تحریک میں سنبھل کا حصہ سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔

ہندوستان کو غلامی کے آہنی شکنجے سے نجات دلانے اور آزادی حاصل کرنے کے لئے ۱۸۵۷ء میں اولین تحریک شروع کی گئی۔ جس کو انگریز سرکار نے بغاوت کا نام دیا۔ برطانوی حکومت کے خلاف ملک کے کونے کونے میں نفرت کی لہر دوڑ گئی اور ہندوستان کے بہادر فرزند سینہ تان کر میدان میں آ گئے۔ انگریزوں نے ان دلیر فرزندوں اور مجاہدین پر ظلم کے دہانے کھول دیئے انہیں مختلف طرح کی اذیتیں دی گئیں۔ ان پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ پھانسی کے پھندوں پر لٹکایا گیا۔ گھر بار لوٹے اور اجاڑے گئے اور ان پر ایسے ظلم کئے گئے جن کا تصور آتے ہیں رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مختلف وجوہات کے سبب یہ انقلابی تحریک کامیاب نہ ہو سکی۔ بھڑکی ہوئی آگ ٹھنڈی تو ہو گئی پر پوری طرح بجھ نہ سکی اور صحیح وقت آنے پر وہ چنگاریاں جو مجبوری کی راکھ میں دبی پڑی تھیں پھر بھڑک اٹھیں اور ملک کے مستانے متوالے آزادی کا نعرہ لگاتے ہوئے تحریک آزادی میں کود پڑے۔ آزادی کی اسی تحریک کو دفع کرنے کے لئے انگریزوں نے پہلے کی طرح مظالم اور اذیتوں کے پہاڑ توڑنے شروع کر دیے۔ ہندوستانیوں کے ساتھ انگریزوں نے بڑی حیوانیت اور درندانہ سلوک کا مظاہرہ کیا۔ لیکن ہندوستانیوں نے ہار نہیں مانی۔ انگریزوں کا ہر ظلم و ستم ہندوستانیوں میں جوش اور ہمّت بڑھاتا رہا۔ انگریزوں سے جو ہو سکتا تھا انہوں نے مجاہدین کے ساتھ کیا لیکن انھوں نے اپنے قدم پیچھے نہیں ہٹائے۔ کیونکہ انھوں نے تو ایک ہی عہد کیا تھا۔

سر فروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے

دیکھنا ہے جوش کتنا بازوئے قاتل میں ہے

سر فروشی کی تمنا دل میں لئے قاتل کے بازوؤں کو آزمانے کا حوصلہ رکھنے والے وطن پرست اور مجاہدین کے کارناموں کا اثر سنبھل پر بھی پڑا۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی شروع ہونے کی اطلاع ملتے ہی شہر اور دیہی علاقوں میں برطانوی حکومت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے تحریک شروع ہوگئی۔

''دہلی میں انگریزوں کے خلاف جنگ ہونے کی خبر ۱۷ رمئی ۱۸۵۷ء کو سنبھل میں پہنچتے ہی سنبھل انگریزوں کی عمل داری سے آزاد ہو گیا''۔

۱۹ رمئی ۱۸۵۷ء کو مرادآباد جیل خانہ توڑ دیا گیا سبھی قیدی چھوٹ گئے سنبھل میں وطن پرستوں کی پہلی کانفرنس تمر داس سرائے میں واقع ''انصاری بلڈنگ'' میں منعقد ہوئی۔ جس کے روح رواں منشی امام الدین ہادی تھے اور اہم رول لالہ نروتم سرن اور شیخ اجیالے کا تھا۔ کانفرنس میں سنبھل کو انگریزی سرکار سے آزاد کرانے کا عہد کیا گیا اور رائے عامہ سے ایک عرضداشت کے ذریعہ بہادر شاہ ظفر کو یقین دلایا گیا کہ سنبھل کی عوام بادشاہ کے ساتھ ہے۔ اسی وقت ایک دستہ عمل میں لایا گیا جس کے سردار میاں جی شیخ ترک تھے۔ جب یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی تو ولسن تلگو کی ٹولی کے ساتھ سنبھل آئے اور انگریزوں کی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کامیابی حاصل نہ کر سکے اور یہاں سے امروہہ چلے گئے۔ سنبھل چار پانچ ماہ آزاد رہا۔

بہادر شاہ ظفر کو بھیجی گئی عرضداشت کے جواب میں ۲۱ راپریل ۱۸۵۸ء کو شہزادہ فیروز سنبھل آیا۔ یہاں اس کا پر جوش مہذبانہ استقبال کیا گیا۔ جس میں سبھی مذاہب قوم

اور فرقوں کے لوگ شامل تھے۔ شہزادہ سنبھل کے حالات سے مطمئن ہو کر مراد آباد پہونچا۔ وہاں کے مجاہدین بھی اس کے ساتھ شامل ہوگئے۔ کرنل کک نے رام گنگا کے کنارے مجاہدین پر حملہ کر دیا اور انہیں بڑی بے رحمی کے ساتھ پامال کر ڈالا۔ اس کے بعد بغیر سوچے سمجھے گرفتاریاں عمل میں لائیں گئیں۔ ان کی جائیداد ضبط کر لی گئیں۔ وطن پرستوں پر گولیاں چلائی گئیں،۔ سنبھل کی بھی ناکہ بندی کی گئی اور یہاں بھی گرفتاریاں عمل میں لائیں گئیں ۔میاں جی شیخ ترک اور منشی امام الدین ہادی کو مراد آباد لے جا کر پھانسی دے دی گئی اور منشی جی کی نعش کو چونے کی بھٹی میں پھونک دیا گیا اور ان کی جائیداد ضبط کر لی گئی۔

انگریزوں کی مکاریوں اور چال بازیوں مظالم اور دیگر وجوہات سے پورے ملک میں تحریک آزادی کو دبا دیا گیا۔ لیکن انگریزوں کی یہ کامیابی برائے نام اور عارضی تھی۔ مجاہدین جس عہد اور جذبہ کے ساتھ تحریک سے وابستہ تھے وابستہ ہی رہے۔ صرف وہ تو جسمانی طور سے تحریک کو آگے نہ بڑھا سکے۔ لیکن ان کا دل اور ان کی روحیں نفرت کی آگ میں دہک رہی تھیں۔ اس لئے موقع ملتے ہی وہ پوری طرح بھڑک اٹھیں اور ایک بار پھر آزادی کی تحریک تیز ہوگئی میاں جی شیخ ترک اور امام الدین ہادی اور ان کے ساتھیوں نے جس تحریک کو اپنے خون سے سینچا تھا اور مفتی عبد السلام جیسے شاعروں نے اپنی شاعری کے ذریعہ اس تحریک کو طاقت بخشی تھی وہ تحریک کچھ وقت کے لئے مدھم تو پڑ گئی تھی لیکن ختم نہیں ہوئی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی انقلابی تحریک کے بعد مختلف آزادی کی تحریکوں میں سینکڑوں وطن پرستوں اور مجاہدین نے حصہ لیا اور ملک کی آبرو اور آزادی کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیا لیکن افسوس کہ ملک کے ان بہادر جوانوں اور مجاہدین کی نہ تو کوئی اطمینان بخش فہرست شائع کی گئی اور نہ ہی ان کی خدمات قربانیوں اور زندگی کی جدوّ جہد اور کارکردگی پر کچھ لکھا گیا ہے

۔اور نہ کوئی ایسا مواد حاصل ہو سکا جس سے شہر کے ان مجاہدین کے بارے میں اطمینان بخش معلومات حاصل ہو سکے۔

اتر پردیش کے شعبۂ اطلاعات کے ذریعہ شائع ہوئی کتاب ''اتر پردیش کے سوتنترتا سنگرام سینانی'' ۱۹۷۰ء میں ضلع مراد آباد کے مجاہدین کا بہت مختصر ذکر کیا گیا ہے۔

اسی عنوان کے تحت مجاہدین کا مختصر اور نامکمل اور غیر اطمینان بخش تعارف دیا گیا۔ جو حسب ذیل مضمون کے آخر میں شامل ہے مسلسل جدوّ جہد بہت تگ دو کے بعد بے شمار وطن پرستوں میں صرف منشی امام الدین ہادی، مفتی عبدالسلام سلام، مولانا مبارک حسین محمودی، مولانا محمد اسمٰعیل، قاری عبدالحق، چودھری ریاست علی،، مولوی عبدالوحید، مولانا عبیداللہ، حافظ نورالحسن، منشی معین الدین انصاری، مولوی سلطان احمد، مولوی عبدالقیوم، ادے پال گپتا، جے نرائن شرما، مہاشیے پیارے لال، چیتن سروپ رستوگی وغیرہ کی جدوّ جہد سے پر زندگی کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکی ہے۔ جیسے سلسلہ وار مضامین کے ذریعہ سامنے لایا جاچکا ہے۔

ساہو چندؤ لال، لالہ واسودیو، ماسٹر روپ کشور جیسے لاتعداد مجاہدین کا تعارف حاصل نہ ہو سکا۔ دیگر وطن پرستوں کے رشتہ داروں اور دوستوں سے بار بار اصرار کرنے پر بھی ناکامیابی ہی ملکی۔ چونکہ مسلم مجاہدین (علماء) پہلی صف میں رہے ہیں۔ ان کی خدمات اور سوانح حیات اس وقت اور بعد میں شائع ہوئی کتب واخبارات میں مل جاتی ہیں جیسا کہ دوسرے مجاہدین (مسلم اور دوسرے مذاہب کو ماننے والے فرزند) کی جدوّ جہد سے پر زندگی پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ ضروت اس بات کی ہے کہ ملک کی آزادی اور وطن کی عزّت کے

لئے تن من دھن کی قربانی دینے اور اپنا سب کچھ ملک پر نچھاور کرنے والے ان مجاہدین کی خدمات اور کارکردگیوں کو اجاگر کیا جائے تاکہ موجودہ نسل اور آنے والی نسلیں اپنے بزرگوں کے کارناموں سے اچھی طرح واقف ہوسکیں اور ان میں حب الوطنی قومی جذبہ ادر ہم آہنگی کے جذبات بیدار ہوسکیں۔

آخر میں اتر پردیش کے سوتنتر تا سنگرام سینانی'' کتاب میں مذکور اور دوسرے سنبھل کے مجاہدین کا مختصر تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

☆ عبدالرحمٰن کو ۳۱-۱۹۳۰ء میں چھ ماہ کی سزا ہوئی۔

☆ عبدالرحمٰن صدیقی ولد جناب حبیب اللہ کو سخت اذیتیں دی گئیں اور ان پر جرمانہ بھی کیا۔

☆ عبدالسلام ولد محمد اسماعیل فتح پور ۱۹۴۱ء میں انڈیا ڈیفنس رول کے تحت ایک سال کی سزا با مشقت اور پچیس روپیہ جرمانہ۔ جرمانہ ادا نہ کرنے پر تین ماہ کی زائد سزا با مشقت۔

☆ علی بخش ولد عیدا ۱۹۴۱ء میں چھ ماہ کی سزا اور پچاس روپے جرمانہ۔

☆ علی حسین ولد ہدایت اللہ ۱۸۸۶ء میں گاؤں مدالہ ڈاکخانہ اسمولی حاتم سرائے سنبھل مرادآباد ۱۹۳۴ء میں کانگریس کے رکن رہے ۱۹۴۳ء میں ہندوستان چھوڑ وتحریک میں حصہ لینے کی وجہ سے ڈیفنس آف انڈیا کی دفعہ (۵) ۳۸ کے تحت ۱۷۷روپیہ جرمانہ کے ساتھ ایک سال کی قید بامشقت کی سزا پائی۔

☆ امرت لال ولد جناب پرسادی لال اسمولی سنبھل مرادآباد عدم تعاون تحریک کے دوران ۱۹۴۱ء میں چھ ماہ کی سخت قید اور پچاس روپیہ جرمانہ کی سزا پائی۔

☆ امام بخش ولد غیاث الدین سرسی مراد آباد نمک ستیہ گرہ تحریک کے دوران ۱۹۳۰ء میں چھ ماہ کی قید با مشقت اور پچاس روپے جرمانہ کی سزا پائی۔

☆ اونکار سنگھ ولد جناب پان سنگھ گاؤں ڈاکخانہ پوانسہ۔ انفرادی ستیہ گرہ تحریک کے دوران ۱۹۴۱ء میں چھ ماہ کی قید با مشقت اور پچاس روپیہ جرمانہ کی سزا پائی۔ ۱۹۴۸ء تک کانگریس میں رہے۔

☆ کیول پرکاش ولد ہرونش اسمولی انفرادی ستیہ گرہ تحریک کے دوران ۱۹۴۱ء میں چھ ماہ کی قید با مشقت اور سو روپے جرمانہ کی سزا پائی۔

☆ کیلاش دیو ولد جناب مان سنگھ گنگیشوری۔ انفرادی ستیہ گرہ تحریک کے دوران ۱۹۴۱ء میں آٹھ ماہ کی قید با مشقت اور سو روپے جرمانہ کی سزا پائی۔

☆ گنگا جاٹو ولد جناب ڈیلو گنگیشوری۔ مراد آباد۔ انفرادی ستیہ گرہ تحریک کے دوران ۱۹۴۱ء میں چھ ماہ کی قید با مشقت اور دس روپے جرمانہ کی سزا پائی۔

☆ چندو لال ولد جناب ولد یوسہائے سرسی ضلع کے سرگرم کارکن جنھیں عدم تعاون تحریک کے دوران ۱۹۲۱ء میں دو سال کی قید با مشقت کی سزا دی گئی۔ نمک ستیہ گرہ تحریک کے دوران ۱۹۳۲ء میں چھ ماہ کی سزا پائی۔ ۱۹۳۲ء دوبارہ چھ ماہ کی قید با مشقت اور پچاس روپے جرمانہ کی سزا پائی۔

☆ چھجو سنگھ ولد جناب جواہر سنگھ حضرت نگر گڑھی سنبھل انفرادی ستیہ گرہ تحریک کے دوران ۱۹۴۱ء میں چھ ماہ کی قید با مشقت اور چالیس روپئے جرمانہ کی سزا پائی۔

☆ چھٹن سنگھ جناب پھول سنگھ رستم پور نیاولی ڈاکخانہ سنبھل انفرادی ستیہ گرہ تحریک کے دوران قید با مشقت کی سزا پائی۔

☆ نذار حسن ولد جناب احمد بخش مدالہ ۔ ۱۹۴۱ء میں ایک سال کی قید اور پچاس روپے جرمانہ کی سزا پائی۔

☆ بدرالدین ولد جناب نعمت اللہ اسمولی ۔ ۱۹۴۱ء میں ایک سال کی قید اور پچاس روپے جرمانہ کی سزا پائی۔

☆ مقصود احمد ولد جناب نور الحق میاں سرائے سنبھل ہندوستان چھوڑو تحریک کے دوران ڈیفنس آف انڈیا رول کی دفعہ (۳۹۔۶) کے تحت ایک سال کی قید با مشقت اور پچاس روپے جرمانہ کی سزا پائی۔

☆ محمد بخش ولد جناب کریم بخش سرائے ترین ۔ ۱۹۳۰ء میں چھ ماہ کی قید اور پچاس روپے جرمانہ کی سزا پائی۔

☆ حافظ حسین بخش بھی تحریک آزادی میں حصہ لینے کی وجہ سے انگریزوں کے ظلم وستم کا نشانہ بنے اور مجبوراً سنبھل چھوڑ کر کاشی پور چلے گئے۔

سعادت علی صدیقی

منشی امام الدین ہادیؔ

منشی امام الدین ہادیؔ سنبھل کے ایک ممتاز اور ذی حیثیت شیخ انصاری خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اس خاندان نے شعر و ادب، علم و فن اور ملک و قوم کی مایہ ناز خدمات انجام دے کر شہر کا نام روشن کیا ہے۔ اس حقیقت پر پردہ پڑا ہوا ہے کہ انصاری خاندان کس زمانے میں ہندوستان وارد ہوا۔ مولانا محمود احمد عباسی نے لکھا ہے کہ اس خاندان کے تین حقیقی بھائیوں میں سے ایک بھائی نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کی۔ یہ بھائی فرنگی محلی لکھنؤ کے انصاری خاندان کے مورث اعلیٰ تھے دوسرے بھائی پانی پت میں مقیم ہوئے جو مشہور شاعر مولانا حالیؔ کے جد امجد تھے اور تیسرے بھائی نے بجنور کے موضع باسٹہ کا انتخاب کیا جو اس زمانے میں اہم علاقوں میں شمار ہوتا تھا۔ اب وہاں شیخ فیضی کے مزار اور مدرسے کے کھنڈرات باقی رہ گئے ہیں۔ اکبر اعظم کے میر منشی شیخ ابوالفضل صدیقی کی آخری اولاد ایک خاتون تھیں۔ ان کا نکاح جن صاحب سے ہوا وہ باسٹہ کے ویران ہو جانے کے بعد سنبھل آ کر آباد ہوئے۔ اسی خاندان میں ایک روشن ستارہ طلوع ہوا جسے شیخ امام الدین کا نام دیا گیا۔ دستیاب شواہد کی بنا پر ان کی پیدائش اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں محلہ تمر داس

سرائے میں ہوئی والد کا نام شیخ حیات الدین انصاری تھا۔ ابتدائی تعلیم انہیں کے سایہ عاطفیت میں حاصل کی بعد ازاں دہلی چلے گئے۔ اکبر شاہ ثانی کے عہد میں قلعہ معلیٰ میں نائب میر منشی کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہوئے۔ قلعہ کی ملازمت کے دوران انھوں نے منشی فرحت اللہ بیگ سے راہ ورسم پیدا کی اور فیض اٹھایا۔ اگر چہ موصوف قلعہ معلیٰ کے حالات سے مطمئن نہیں تھے لیکن بادشاہ اور میر منشی کے اصرار پر فرائض منصبی انجام دے رہے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کے تخت نشیں ہونے کے بعد جب صورتحال ناگفتہ بہ ہوگئی اور مرزا الٰہی بخش کی ریشہ درانیوں سے مخلص اور وفاداروں کی حیثیت گھٹ گئی نیز موقع پرست غالب آگئے تو منشی جی بددل ہوکر ۱۸۴۰ء میں سنبھل واپس آگئے۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی تحریک آزادی کے آغاز سے قبل تک انھوں نے مرادآباد میں وکالت کی اور ممتاز وکیل کی حیثیت سے معروف ہوگئے۔ پہلی تحریک آزادی کا شعلہ بھڑکتے ہی سنبھل میں بھی انگریزوں کے خلاف نفرت کا لاوا پھوٹ پڑا اور یہاں کے جیالے سپوت وطن عزیز کو غلامی کے شکنجے سے نجات دلانے کی غرض سے میدان عمل میں کود پڑے۔ منشی امام الدین تو میر کارواں کی حیثیت رکھتے تھے۔

جوش جہاد اور جذبہ حریّت نے انہیں ہوش وخرد سے بیگانہ کر دیا۔ اسی اثنا میں شہزادہ فیروز سنبھل آیا تو انھوں نے والہانہ جذبے کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا اور انگریزوں کے خلاف جنگ میں اس کا ساتھ دیا انھوں نے شہزادے کی فوج کی میزبانی کے فرائض بھی انجام دیئے۔ جب مرادآباد پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا اور مجاہدین آزادی کو ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا تو انگریز حاکموں نے ان کے خلاف اشتقاقی کاروائیاں شروع کر دیں۔ ڈپٹی ولایت علی کو منشی امام الدین سے ذاتی پرخاش تھی۔ انھوں نے منشی جی کے خلاف انگریز حاکموں کے کان بھر دیئے کہ انہیں صفائی کا موقع دینا خطرے سے خالی نہیں۔ انہیں کسی طرح کا موقع دیئے

بغیر سخت سزا دی جائے۔انگریزوں کو تو ایسے غدّاروں کے خون سے انتقام کی پیاس بجھانا تھی ۔ایک ہندوستانی وہم وطن وفادار برطانیہ' کی صلاح نے آتش غضب کو ہوا دی اور ان کے لئے ایسی غضب ناک ودہشت انگیز سزا تجویز کی گئی کہ جس کے تصوّر سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔مرادآباد کے نواب مجو خاں اور سنبھل کے منشی امام الدین کو سزائے موت سنا دی گئی ۔نواب مجو خاں کو ہاتھی کے پیروں تلے روند کر جام شہادت نوش کرایا گیا اور ساری جائداد ضبط کر لی گئی اور منشی امام الدین ہادی کو مرادآباد کے گل شہید کے مقتل میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا اور نعش چونے کی بھٹّی میں پھونک دی گئی۔ان کی کل جائداد بھی ضبط کر کے نیلام کر دی گئی۔مرحوم کی بیوہ کو اپنے حقیقی ماموں کے دامن میں پناہ لینی پڑی۔

شہید وطن منشی امام الدین ہادؔی سچے وطن پرست بھی تھے اور عالم باعمل بھی ۔ان کو اردو فارسی ،اور عربی زبانوں پر قدرت حاصل تھی سخن فہمی وسخن سنجی خدا داد تھی ۔ انھوں نے چکّی کی مشقت کے ساتھ ساتھ عروس سخن کے گیسو بھی سنوارے ۔ان کا تخلص ہادؔی تھا جہاد آزادی میں انکی حیثیت امام کی تھی تو کوچہ شاعری میں ہادؔی کی ۔ ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء کے مصنف مولانا امداد صابری نے لکھا ہے۔

جناب ہادی علوم دینیہ سے پوری طرح واقف تھے اور اپنے دور کے مشہور عالموں میں سے تھے۔ان کا ایک شعر بہت مشہور ہے۔

جو رحمت کی ہے آدم پر تو ہادؔی کو بھی بخشے گا
وہ تیری شان غفاّری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

منشی معین الدین انصاری

منشی امام الدین کے بیٹے منشی حمید الدین مرحوم بعض ناگزیر مجبوریوں کے باعث تحریک آزادی میں عملی طور پر شریک نہ ہو سکے۔ لیکن انھوں نے اپنے وطن پرور خیالات اور غاصبانہ جذبات کو اپنی اولادوں میں مشتعل کر دیا۔ یہ ان کے باغیانہ خیالات و رجحانات کا اثر تھا کہ ان کے بڑے بیٹے منشی نور الدین نے تحریک خلافت میں سرگرمی سے حصہ لیا تھا اور میرٹھ ضلع کانگریس کے صدر کی حیثیت سے آزادی وطن کے لئے جدوّجہد کرتے رہے، آخر کار گرفتار ہوئے اور میرٹھ جیل میں قید کر دیئے گئے۔ اس وقت وہاں مولانا آزاد بھی اسیر فرنگ تھے۔ مولانا کی بعض صحبت سے ان کے خیالات کو جلا ملی۔ رہائی کے بعد گڑھ مکتیشور میں رہائش اختیار کر کے خدمت وطن میں لگ گئے ۱۹۴۶ء کے قتل عام میں بلوائیوں کے ہاتھ شہید کئے گئے چھوٹے بھائی معین الدین بھی بزرگوں کی تقلید میں پیچھے نہ رہے اور اپنے دادا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لیا۔

منشی معین الدین اگست ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم سنبھل میں ہی حاصل کی، اوائل عمر سے ہی قومی تحریک میں حصہ لینے لگے۔ ۱۹۲۹ء میں کانگریس کی رکنیت اختیار کی اور سماجی وقومی خدمت میں جٹ گئے۔ ایک مدت تک سنبھل کانگریس کمیٹی کے صدر رہے۔ ۱۹/۱۱ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو باغیانہ تقاریر کی پاداش میں گرفتار ہوئے۔ جیل میں طرح

طرح کی صعوبتیں جھیلیں ۔ مارچ ۱۹۴۱ء میں گاندھی اروِن معاہدے کے تحت رہائی ملی ۱۹۴۱ء میں جب بمبئی میں کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ کے سرکردہ رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا تو انھیں بھی حراست میں لے لیا گیا۔ حکام نے مختلف طریقوں سے دباؤ ڈالا کہ وہ کانگریس کی حمایت ترک کر کے انگریزوں کی وفاداری کا وعدہ کر لیں لیکن ان کے قدم نہ ڈگمگائے ۔ ۱۰ر اگست کو انہیں مرادآباد جیل میں قید کر دیا گیا جہاں مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ پہلے سے ہی قید تھے ۔ نظر بندوں کو پانچ کوٹھریوں میں حصہ دیا گیا اور سخت پابندیاں عائد کر دی گئیں ۔ ایک ہفتہ کے بعد مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم، مولانا سید محمد میاں، مولانا اسماعیل سنبھلی مرحوم، قاری عبداللہ، حافظ محمد ابراہیم مرحوم وغیرہ بھی یہیں بھیج دیئے گئے ۔ حافظ محمد ابراہیم اور منشی جی کو ایک کوٹھری میں بند کر دیا گیا ۔ مارچ ۱۹۴۳ء میں ان کے بعض خیر خواہوں نے ان کی لاعلمی میں پیرول پر رہا کرنے کی درخواست دے دی جو منظور ہو گئی لیکن انہوں نے رہا ہونے سے انکار کر دیا۔ جولائی ۱۹۴۴ء میں سید محمد میاں اور منشی جی کے سوا سبھی قیدی پیرول پر رہا ہو گئے ۔ ۱۹۴۵ء میں جب گاندھی جی نے جواہر لال نہرو کو اپنا جانشین مقرر کر کے عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور بین اقوامی سیاست نے نیا موڑ لیا ۔ جنگ عظیم کے اثرات ہندوستان میں بھی نمایاں ہونے لگے تو منشی جی کو بھی رہا کر دیا گیا ۔ اور وہ قومی و ملکی خدمت میں مصروف ہو گئے ۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کے حالات سے وہ دل برداشتہ ہو گئے اور گوشہ نشینی اختیار کر لی ۔ ۷ر فروری ۱۹۷۴ء کو ریاستی حکومت نے انہیں تامر پتر دے کر ان کی خدمات کا اعتراف کیا ۔ ۱۹۷۹ء میں ان کی وفات ہو گئی اور آبائی قبرستان میں دفن ہوئے ۔

مولوی شیخ عبدالوحید

مولوی عبدالوحید سنبھل کے قدیم شیخ ترک خاندان کے چشم و چراغ تھے ان کے والد ماجد مولوی عبدالمجید اپنے عہد کے ممتاز عالم دین اور معروف استاذ تھے۔ ان کا شمار دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء کے اکابر معلّموں میں ہوتا تھا حلقۂ تلامذہ وسیع تھا۔ سمرقند بخارا جیسے دور دراز کے تشنگان علم دین ان سے شرف تلمذ حاصل کرنے کے مشتاق رہتے تھے ۔مولانا محمد منظور نعمانی جیسے معروف عالم نے ان سے فیض حاصل کیا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ سنبھل کے بیشتر علماء جن میں دیوبندی و بریلوی دونوں مسلک کے عالم شامل ہیں۔ مولوی عبدالمجید مرحوم (متوفی ۱۹۵۳ء) کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا اور علوم دین سے فیض یاب ہوئے۔ انھیں کے یہاں ۱۸۹۸ء میں جس بچے کی ولادت ہوئی اُس بچے کا نام عبدالوحید رکھا گیا۔

مولوی عبدالوحید نے مذہبی ماحول میں آنکھ کھولی اور علمی ماحول میں پروان چڑھے۔ ابتدائی تعلیم والد ماجد سے حاصل کی پھر مدرسہ سراج العلوم سنبھل مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور اور دارالعلوم دیوبند جیسے مشہور و معروف مدارس سے فارغ التحصیل ہوئے۔ حصول تعلیم کے ساتھ ساتھ قوم و ملّت کی خدمت کا جذبہ پروان چڑھتا رہا۔ گرچہ اُجداد زمیندار گھرانے کی روایات کے امین تھے اور زراعت و کاشت کاری ان کا آبائی پیشہ تھا مگر

مولوی عبدالمجید مرحوم نے علوم دین کی خدمت کو مقصد حیات بنایا۔ یہی اثر مولوی عبدالوحید پر غالب رہا۔ انہوں نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد خدمت دین کے ساتھ خدمت وطن کو اپنا شعار بنایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے دیگر مقامات کی طرح سنبھل میں بھی غیر ملکی سامراج کے خلاف نفرت وغصے کی آگ پھیلتی جارہی تھی دیگر سرفروشوں کی طرح مولوی عبدالوحید بھی سرگرم مجاہد کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دینے میں پیچھے نہ تھے انھوں نے جہاد آزادی کی ترغیب دینے اور تحریک کو تیز تر کرنے کی غرض سے رنگون مالٹا، اور برما کے سفر بھی کئے اور ملک کے اکابر رہنماؤں سے رابطہ قائم کیا۔ انگریز حکمرانوں کو ان کی حب الوطنی اور مجاہدانہ سرگرمیاں ایک آنکھ نہ بھائیں۔ تحریک آزادی میں سرگرم حصہ لینے غلامی کے خلاف رائے عامہ کو بیدار کرنے اور ان میں حصول آزادی کی خواہش پیدا کرنے کے جرم میں ۱۹۳۰ء کو جیل کی آہنی سلاخوں میں بند کر دیا گیا جیل میں ان کو مشقت کرنے پر مجبور کیا گیا اور اپنے مشن سے دست بردار ہونے کی ترغیب دی گئی۔ انھوں نے ہر طرح کے حالات کا پامردی سے مقابلہ کیا لیکن جو قدم آگے بڑھایا تھا پیچھے نہ ہٹایا۔ چار ماہ کی قید با مشقت جھیلنے کے بعد رہا کئے گئے۔ رہا ہونے کے بعد پھر اپنے کاز کی خاطر سرگرم عمل ہو گئے۔ اور یہ سلسلہ حصول آزادی تک رہا۔

آزادی کا سورج طلوع ہونے کے بعد مولوی عبدالوحید نے سرگرم سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اور گوشۂ تنہائی میں ملک وقوم کی خاطر کوشاں رہے۔ خاموش خدمت کا یہ عمل آخری سانس تک جاری رہا۔ ۱۸ر اکتوبر ۱۹۷۳ء کو تحریک آزادی کا یہ سرگرم مجاہد ہمیشہ کے لئے قید حیات سے بھی آزاد ہو گیا آبائی قبرستان واقع پختہ باغ حسن پور روڈ میں سپرد خاک کئے گئے۔ ہزاروں سوگوار آنکھوں نے اپنے محبوب کو الوداع کہا۔

قاری عبدالحق

سرگرم مجاہد آزادی قاری عبدالحق ، نرم دم گفتگو ، گرم دم جستجو کی روشن مثال تھے۔کردار کے غازی، عمل کے مجاہد، انسانیت کے پرستار، مذہب کے شیدائی، حق و صداقت کے پیکر قاری عبدالحق مرحوم مادر وطن کے ان جیالے سپوتوں میں ایک تھے جن کی پوری زندگی قربانی وایثار سے عبارت ہے وہ ۱۸۸۰ء میں سرائے ترین کے ایک ذی عزّت گھرانے میں پیدا ہوئے۔قاری صاحب کے والد الحاج عبداللہ بہترین امانت دار اور ممتاز تاجر تھے۔ان کا انتقال مکہ معظمہ میں ہوا۔ان کے وصال کی خبر ایک درویش نے دی تھی جوان کے دروازے پر جذب کی حالت میں پڑا رہتا تھا۔قاری صاحب کی والدہ مریم مرحومہ حافظ محمد رفیق کی صاحبزادی تھیں اور خود بھی حافظ تھیں۔حافظ محمد رفیق اپنے وقت کے جید عالم تھے ان کے شاگرد دور دراز تک پھیلے ہوئے ہیں۔قاری صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنی والدہ سے حاصل کی پھر دار العلوم دیوبند تشریف لے گئے۔ جہاں شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کے ایک قریبی ساتھی مولوی حبیب اللہ شاہجہاں پوری کے ہمراہ قیام کرنے کا موقع ملا۔ وہاں قرآن پاک حفظ کیا بعد ازاں قاری حمید اللہ سنبھلی اور مدرسہ شاہی مراد آباد کے استاد قاری عبداللہ مراد آبادی سے استفادہ کیا۔مراد آباد کے قیام کے دوران حافظ عبدالرحمن مراد آبادی سے قربت بڑھی جو عقیدت کا روپ اختیار کر گئی۔

حافظ عبد الرحمٰن حضرت سائیں توکّل شاہ انبالوی کے خلیفہ ومجاز تھے۔ سائیں توکّل شاہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے خلیفہ تھے۔ قاری صاحب کا حافظ عبد الرحمٰن سے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ وہ سرائے ترین سنبھل سے مرادآباد تک اکثر وبیشتر پیدل اور کبھی کبھی سائیکل سے ملاقات کرنے جاتے تھے۔ اسی زمانے میں قاری صاحب کے دل میں حج کا شوق پیدا ہوا۔ سفر کے لئے کچھ پاس نہ تھا صرف ایک پیسہ جیب میں پڑا ہوا تھا۔ لیکن جذبہ شوق زیارت اتنا بڑھا کہ حافظ عبد الرحمٰن مرحوم کی اجازت لے کر چل پڑے۔ حافظ جی نے اپنے پیر حاجی محب الدین مکی کو تعارفی رقعہ لکھ کر دیا جو قطب العالم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکّی کے مکہ معظمہ میں خلیفہ تھے۔ وہاں ایک سال قیام کیا قیام کے دوران قاری عبد الحق نے دعا حزب الجر کا عمل حاصل کیا اور مکمل عامل بن کر واپس آئے۔

حافظ عبد الرحمٰن کے انتقال کے بعد قاری عبد الحق نے مولانا حسین احمد مدنی سے بیعت کی اور یہیں سے ان کی زندگی میں انقلاب آیا روحانیت مذہبیت کا علمبردار سیاست و وطنیت کی طرف راغب ہوا۔ مولانا مدنی کی فعال ومتحرک شخصیت سے وہ اتنے زیادہ متاثر ہوئے کہ تحریک آزادی کے سرگرم و بے لوث مجاہد بن کر ابھرے۔ مولانا مدنی کی رہنمائی و سرپرستی میں کانگریس اور جمیعت علماء کے پلیٹ فارم سے خدمت وطن میں جی جان سے لگ گئے۔ سول نافرمانیوں کی تحریک میں جوش وخروش سے حصہ لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں گرفتار کر لیا گیا اور نو ماہ کی قید بامشقت کاٹی۔ رہا ہونے کے بعد حصول آزادی تک وہ اسی جذبے سے سرشار رہے۔ مصائب وآلام کا سامنا کیا۔ ایثار وقربانی سے کام لیتے رہے پریشانیوں وتکلیفوں کو دعوت دیتے رہے۔ لیکن جو قدم اٹھ چکے تھے پیچھے نہیں ہٹائے۔

ہندوستان آزاد ہونے کے بعد قاری عبد الحق مرحوم نے عملی سیاست سے

کنارہ کشی اختیار کر لی اور مذہبی کاموں میں مصروف ہوگئے ۔ پہلے مدرسی و معلمی کا فریضہ انجام دیا پھر خدمت خلق کی طرف تعویذ و عملیات کا سلسلہ شروع کیا جو تادم آخر جاری رہا۔ قاری عبدالحق مرحوم کی خدمات کے صلے میں ریاستی حکومت نے انہیں تامر پتر سے بھی نوازا اور مرکزی وریاستی حکومت کی جانب سے پنشن بھی دی گئی جو تاحیات جاری رہی۔ یکم رستمبر ۱۹۸۴ء کو مادر وطن کا یہ سرگرم مجاہد ہمیشہ کیلئے داغ مفارقت دے گیا اتوار ۲ رستمبر کو ۹ ربجے د ن آبائی قبرستان میں تدفین ہوئی۔

قاری عبدالحق مرحوم نے چار شادیاں کیں اور چودہ اولادیں ہوئیں ۔ ایک صاحبزادے عبدالخالق اور ایک صاحبزادی مسماۃ اللہ ولی بیگم حیات ہیں مرحوم کو نثر نگاری کا ملکہ بھی حاصل تھا اور نظم نگاری کا بھی ۔ ایک منظوم تصنیف ''مسدس حق'' مرحوم کی یادگار ہے مرحوم کے انتقال کے بعد مولوی محمد ظریف نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے۔

هم شریک و مشورائے نورحق
هست حضرت حاجی قاری عبدحق
نقش تعویذ ش مثال نقش قدر
فیضِ اُو بر خاصی و عامی مثل بدر
عاملِ کامل ولی مرد خدا
پائے او بر پائے فخر انبیاء
هم جمالی هم جلالی شان وا
کانِ علم و مخزنِ خلق نکو

مولانا مبارک حسین محمودی

مولانا مبارک حسین سنبھلی بھی مجاہدین سنبھل کے اس قبیل سے تعلق رکھتے تھے جنھوں نے ناموس وطن اور عزت نفس کی خاطر انگریزی سامراج سے مورچہ لیا اور آزادی وطن کے لئے ہر طرح کی قربانیاں دیں۔ انھوں نے مصائب وآلام کا سامنا بھی کیا زنداں کی تاریک وتنگ کوٹھریوں کی قید بھی بھگتی اور طرح طرح کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ لیکن ان کے دل میں حب الوطنی کی جو آگ سلگی تھی وقت کے طوفان کے ساتھ تیز تر ہوتی گئی اور وہ زندگی کی آخری سانس تک اسی راہ پر چلتے رہے، جس کا انتخاب انہوں نے کیا تھا۔

''مولانا مبارک حسین صاحب ۱۸۷۸ء میں سنبھل کے محلہ دیپا سرائے میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ احمد حسین تھا جو کھانڈ کے کاروباری حضرات میں انتہائی متمول درجہ کے تھے پورے ایک موضع کے زمیندار تھے مذہبی رجحانات کے حامل اور فارسی کا اعلیٰ ذوق رکھنے والے تھے''

مولانا مبارک حسین نے ابتدائی تعلیم وطن میں ہی حاصل کی۔ مکتبی تعلیم کے ساتھ ایک پشاوری عالم بھی اتالیف مقرر کئے گئے۔ جنھوں نے اپنے طالب علم کو فلسفہ منطق اور ہیئت پر عبور حاصل کرایا۔ ۱۹۱۰ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور دورہ حدیث پڑھا۔ ۱۹۱۱ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔

دارالعلوم دیوبند میں مولانا نے مولانا محمود الحسنؒ اور مولانا انور شاہؒ کی شاگردی کا شرف حاصل کیا تھا۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ان کے ہم سبق تھے۔ وہ ایک ذہین، حساس اور سعادت مند طالب علم تھے۔ مولانا محمود الحسن نے اپنے شاگرد کی فطری صلاحیتوں کو بھانپ لیا اور ان کی تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ یہ مولانا کے فیض صحبت کا نتیجہ تھا کہ انکے دل میں بھی وہی جذبہ حریت موجیں مارنے لگا جو استاذ کا طرۂ امتیاز تھا۔ انھیں خطابت کا شوق تو طالب علمی کے زمانے سے ہی تھا۔ مطالعہ و مشاہدہ کے ساتھ ساتھ اس میں پختگی اور سنجیدگی آتی گئی اور یہ مردِ مجاہد جذبہ حُب قومی سے سرشار ہو اٹھا۔ دریں اثنا مولانا ثناء اللہ امرت سری اور مولانا ابراہیم سیالکوٹی جو ان کے ہم جماعت اور ہم سبق تھے' کی صحبتوں نے ان کے دل میں مناظرہ کا ذوق بھر دیا۔ اور وہ بہت جلد ہندوستان کے ممتاز مناظر کی حیثیت سے معروف ہو گئے۔ ۱۹۱۲ء کے ایک مناظرے میں جو بریلی میں ہوا اور جس میں مولانا ثناء اللہ اور بہت سے مقتدر علماء شریک تھے۔ مولانا مبارک حسین نے اپنی جماعت کی نمائندگی کی اور زبردست کامیابی حاصل کی یہیں انھیں ''شیر اسلام'' کے خطاب سے نوازا گیا۔

۱۹۱۵ء میں انھوں نے خورجہ میں قاسم العلوم کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا۔ جو آج بھی اہم دینی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اسی زمانے میں دارالعلوم میں صدر مدرس کی

ضرورت پیش آئی تو مبارک حسین سنبھلی صاحب کو وہاں صدر مدرس کی حیثیت سے بلالیا گیا ۔اس طرح وہ ۱۹۱۹ء میں خورجہ سے میرٹھ منتقل ہو گئے ۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب تحریک خلافت کا آغاز ہو چکا تھا ۔مولانا مبارک حسین جو مولانا محمود الحسن جیسے عالم اور جیالے مجاہد کے شاگرد رشید تھے اور تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ عرصہ تک مختلف اسفار میں شریک رہے تھے ۔اس تحریک سے دامن کیسے بچا سکتے تھے، وہ نہ صرف یہ کہ اس تحریک میں شامل ہوئے بلکہ مجاہدانہ سرگرمیوں اور جوش عمل کے باعث قافلہ سالار بن گئے ۔انھیں ضلع میرٹھ کی خلافت کمیٹی کا ناظم اعلیٰ مقرر کر دیا گیا ۔اسی زمانے میں شہر کے مختلف رہنماؤں ومجاہدوں کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے گئے مولانا کا نام سرفہرست تھا ۔یہ بات بھی مشہور ہے ان کی گرفتاریوں کے خلاف شہر میں بغاوت کے اعلان کے لئے جامع مسجد کے میناروں پر نقارے رکھے گئے ۔

اس اسکیم کے منتظمین میں مولانا بھی شامل تھے اس کے بعد مولانا کی سیاسی سرگرمیاں روز بروز بڑھتی گئیں ۔دارالعلوم کے مہتمم ایک ریٹائرڈ پولیس سب انسپکٹر تھے ۔انھیں مولانا کی سرگرمیاں ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں ۔پہلے تو انھوں نے مولانا کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ملنے پر ڈرانے دھمکانے کی سعی کرنے لگے مولانا کی غیر معمولی مقبولیت کی وجہ سے انھیں مدرسہ سے سبکدوش کرنے کی جرأت تو ان میں نہ تھی اس لئے ۱۹۲۷ء میں مدرسہ کے بند کرنے کا اعلان کر دیا اس اعلان سے عوام میں انسپکٹر کے خلاف غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی ۔اگلے ہی جمعہ کو مولانا مبارک حسین سے سلطان ناصر الدین محمود کی تعمیر کردہ عالی شان ووسیع جامع مسجد میں مدرسہ چلانے کی استدعا کی گئی یہ استدعا ایک عظیم الشان جلسے میں کی گئی جس میں انھیں مدرسہ کا ناظم اعلیٰ بھی مقرر کیا گیا اس طرح ادارہ

دارالعلوم میرٹھ کا قیام عمل میں آیا جو اب تک قائم ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب مولانا تحریک آزادی میں پورے جوش وجذبہ کے ساتھ شریک تھے اور مدرسہ کے انتظام وانصرام کی ذمہ داریاں بھی نبھا رہے تھے مدرسے کے مصارف کا بار بھی ان پر آپڑا تھا انھوں ے نہایت ہمت و جرأت کے ساتھ ان حالات کا سامنا کیا۔ ایک زمانے تک انھوں نے مدرسہ سے کوئی مشاہرہ نہیں لیا بلکہ اکثر مواقع پر اپنی طرف سے مدد بھی کی۔ مدرسے کے سلسلے میں انھوں نے رنگون اور برما کا سفر بھی کیا اور اسے ایک یادگاری ادارہ کی شکل دینے کی کوشش کرتے رہے۔ مدرسہ میں جب طلباء کی تعداد بڑھنے لگی اور عمارت کم نظر آنے لگی تو مولانا نے محلّوں میں کچھ مکانات کرائے پر حاصل کر کے ضرروتوں کی تکمیل کی۔ حاکم وقت چونکہ ان سے خفا تھے اس لئے ان مکان کے مالکوں وورثوں کو تنگ کیا جانے لگا۔ مجبور ہو کر مولانا نے شہر کے وسط میں محلّہ مشائخاں میں ایک وسیع قطعہ آراضی خریدی اور ۱۹۲۵ء میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے دست مبارک سے دارالطلبہ کا سنگ بنیاد رکھوایا اور بہت جلد اسے سہ منزلہ عمارت کی شکل دے دی یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس مدرسہ کی تعمیر میں غیر مسلم حضرات نے بھی عطیات دیئے۔ یہ عمارت ''یادگار شیخ الہندؒ'' کے نام سے موسوم ہے جب جمیعۃ علماء ہند کا قیام عمل میں آیا تو مولانا اس سے پوری طرح وابستہ ہو گئے ابتدا میں وہ ضلع میرٹھ کے ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے اس کے بعد مرکزی مجلس عاملہ کے رکن بنے۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ مولانا احمد سعید، مولانا سجاد بہاری اور مولانا مفتی محمد نعیم بھی ان کے رفقائے کار میں سے تھے۔

اس وقت میرٹھ کشمکش کا اہم مرکز بنا ہوا تھا۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ ایک طرف یہاں انگریزی فوج کی زبردست چھاونی تھی تو دوسری طرف انگریز پرست خاں بہادروں

اور رائے بہادروں کی کمی نہ تھی۔ان حالات میں بھی مادر وطن کے جیالے سپوت جہاد آزادی کی لوکو تیز کررہے تھے۔مولانا مبارک حسین بھی پیش پیش تھے۔ ۱۹۳۶ء میں جب جمعیۃ علماء ہند نے کانگریس کی سول نافرمانی تحریک میں شرکت کا فیصلہ کیا اور ایک بورڈ کی تشکیل عمل میں لائی گئی اور انتظام کی دیکھ ریکھ کیلئے ڈکٹیٹر بنائے گئے تاکہ سلسلہ وار گرفتاری کے مشن کو جاری رکھیں اس تنظیم میں مولانا کا نمبر چوتھا تھا نمبر آنے پر انھوں نے تحریک کے نظام کو اپنے ہاتھ میں لیا۔نتیجے میں خود بھی گرفتار کر لئے گئے۔ان کی یہ گرفتاری دہلی کے ایک جلسہ میں ولولہ انگیز تقریر کرنے کے دوران عمل میں آئی۔

اس کے بعد جب وائسرائے کی کونسل کی نشست کیلئے نواب زادہ لیاقت علی خاں امیدوار ہوئے تو ان کے مقابلے میں جمعیۃ علماء ہند نے محمد احمد کاظمی کو اپنا نمائندہ بنایا اور انتخاب کی تیاری کے سلسلے میں مولانا مدنی میرٹھ آئے اور دارالعلوم میں قیام کیا انھوں نے مولانا مبارک حسین کو اس الیکشن کا انچارج مقرر کر دیا۔انھوں نے یہ فریضہ بڑی خوش اسلوبی اور تندہی سے انجام دیا۔ ۱۹۳۹ء میں جب جنگ عظیم شروع ہوئی تو برطانیہ نے اتحادی فوجوں کے ساتھ جنگ میں شرکت کا اعلان کر دیا جمعیۃ علماء ہند نے اس اعلان کی مخالفت کی اور اجلاس بلانے کا فیصلہ کیا۔مجوزہ اجلاس میرٹھ میں منعقد ہوا جس میں مولانا حسین احمد مدنی کے علاوہ ہندوستان بھر کے مقتدر علماء شریک ہوئے۔یہ وہی تاریخی اجلاس تھا جس میں مولانا عبیداللہ سندھی برسوں کی جلاوطنی کے بعد شامل ہوئے مشہور کمیونسٹ رہنما ڈاکٹر محمد اشرف بھی شریک جلسہ تھے اس جلسہ میں بے مثال بے خوفی و بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جنگ میں غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ کیا گیا۔

مولانا سنبھلی علم وعمل کے پیکر اور یقین محکم کی مجسم تصویر تھے۔ایک طرف انھوں نے ملک وقوم کی خاطر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا رکھا تھا تو دوسری طرف درس وتدریس اور تصنیف و تالیف سے بے خبر نہ رہے۔انھوں نے متعدد کتابیں لکھیں جو آج بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔مختصر یہ کہ اس عالم باعمل نے تقریباً نصف صدی تک قوم وملک اور علم وفن کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔مئی ۱۹۴۲ء میں ان پر لو کا حملہ ہوا جو فالج میں تبدیل ہو گیا۔چند دن صاحب فراش رہ کر ۱۶/مئی ۱۹۴۲ء کو صبح دس بجے راہی ملک عدم ہوئے۔''تربت نائب رسول'' سے تاریخ وفات کا سن برآمد ہوتا ہے۔

مولانا محمد اسمٰعیل

مولانا محمد اسمٰعیل کا تعلق ترک برادری سے ہے سلطان التمش کے قلعہ سنبھل کے شمالی علاقہ میں میں ترکوں کی آبادی ہے۔ ۱۸۹۸ء میں پیدائش ہوئی والد کا نام منشی کفایت اللہ ہے جنکی ۱۹۱۴ء میں وفات ہوئی ،مولانا اسمٰعیل کی ابتدائی تعلیم سنبھل میں ہوئی پھر مدرسہ سراج العلوم میں داخل ہوئے اسی زمانے میں جلیانوالہ باغ کا انسانیت سوز واقعہ پذیر ہوا۔ سنبھل میں بھی عام ہڑتال کی گئی اور ایک بڑا جلسہ ہوا اس میں مولانا اسمٰعیل نے بھی نہایت جوشیلی تقریر کی۔ مقرروں میں مولانا سب سے چھوٹے اور ناتجربے کار تھے اسی تقریر سے ان کی قومی زندگی کا آغاز ہوا۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی وفات کے چند ماہ بعد جب وہ دارلعلوم دیوبند کے طالب علم تھے ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں میں اور تیزی آئی اور وہ پر جوش تقاریر اور باغیانہ خیالات کے باعث انگریزوں کی نگاہ میں کھٹکنے لگے اور ۲۲ رفروری ۱۹۲۲ء کو انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ دو تین دن کے بعد مرادآباد جیل میں مقدمہ شروع ہوا اور دو سال قید با مشقت کا حکم سنایا گیا۔ جیل میں مولانا کو سخت اذیتیں دی گئیں کولھو چلانے ،چکّی پیسنے کے ساتھ ساتھ پنجرے میں بھی بند کر دیئے جاتے تھے۔ رات کو سوتے وقت ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنادی جاتی تھیں۔ ستمبر ۱۹۲۳ء میں رہائی ملی۔ قید فرنگ سے رہائی پاکر مولانا

نے ادھوری تعلیم تکمیل کی طرف توجہ دی اور تقریباً ڈیڑھ سال مدرسۃ الشرع سنبھل میں فنون کا مطالعہ کیا پھر دیوبند جاکر سید انور شاہؒ کشمیری اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور دوسرے اساتذہ سے سند فراغ حاصل کی۔ ۱۹۲۴ء کے اواخر میں جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی میں مدرس ہوگئے۔ ۱۹۳۰ء میں کانگریس نے مکمل آزادی کا نعرہ دیا ۲۶ر جنوری کو پورے ملک میں یوم آزادی منایا گیا۔ ۱۳ر مارچ کو ملک کے قانون کی خلاف ورزی کے لئے مہاتما گاندھی نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی۔ اس میں جمعیۃ علماء ہند نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور دائرہ حربیہ قائم کیا اس سلسلہ میں مفتی کفایت اللہؒ مولانا احمد سعیدؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ مولانا مبارک حسین سنبھلی گرفتار ہوئے ان کے بعد مولانا اسمٰعیل ساتویں ڈکٹیٹر کی حیثیت سے گرفتار کئے گئے اور چھ ماہ قید بامشقت کی سزا ملی۔ دہلی جیل کے بی کلاس میں رکھا گیا اور ایک ماہ بعد ملتان جیل منتقل کردئے گئے اور مدت پوری ہونے کے بعد رہا ہوئے ۱۹۳۴ء میں مرکزی اسمبلی کے انتخاب کے موقع پر مولانا یونٹی بورڈ مرادآباد کے نگراں نامزد کئے گئے بورڈ کے امیدواروں کی کامیابی میں مولانا کا بڑا ہاتھ تھا اور ان کا اثر کافی بڑھ چکا تھا صوبہ جاتی اسمبلیوں کے انتخاب کے موقع پر جب مسلم لیگ پارلی مانی بورڈ کا قیام عمل میں آیا تو مسٹر جناح نے جمعیۃ علماء کے بیس ممبر نامزد کئے۔ مرکزی بورڈ کے تحت صوبہ جاتی بورڈ بنے تو یوپی میں مولانا کو بھی شامل کیا گیا اور تحصیل بلاری و سنبھل سے انہیں امیدوار بھی بنایا گیا۔ ان کے مقابلے میں معروف شخصیت عاشق حسین خاں کو کھڑا کیا گیا جو دس ہزار روپے کے مال گزار اور بیس سال سے میونسپل بورڈ کے چیرمین تھے لیکن الیکشن میں مولانا کو فتح حاصل ہوئی اور قوم پرور طبقہ کو بڑی تقویت ملی۔ الیکشن میں حکومت پرست جماعتوں کے مقابلے میں مسلم لیگ پارلی مانی بورڈ کے امیدواروں کو شاندار کامیابی ملی۔

لیکن کامیابی کے بعد محمد علی جناح نے حکومت نواز شخصیتوں کو پارٹی میں شامل کرنے کی کوشش شروع کردی۔ مولانا نے اس کی ڈٹ کر مخالفت کی اور اعلان کیا کہ وہ اپنے نصب العین چھوڑنے کے لئے نہیں صرف الیکشن کی غرض سے بورڈ میں شامل ہوئے تھے۔ ان کی ولولہ انگیز تقریر کا متن مولانا مدنی کی ایک کتاب میں شامل ہے۔ اس کے بعد ہی مولانا با قاعدہ طور پر کانگریس میں شامل ہو گئے ۱۹۰۴ء میں عدم تشدد پر مبنی تحریک سول نافرمانی شروع ہوئی جس میں مولانا نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا انجام کار انھیں مرادآباد میں گرفتار کرلیا گیا اور ۹ ماہ قید کی سزا ملی ۱۹۴۲ء میں ہندوستان چھوڑو تحریک کے تحت وہ پھر گرفتار ہوئے۔ تقریباً ایک سال بعد رہائی ملی، ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں انھوں نے مسلم لیگ امیدوار کے مقابلے پر کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا اور دوسری بار ممبر چن لئے گئے۔ ممبر اسمبلی ہونے کے بعد انھوں نے مدرسہ شاہی کی ملازمت سے سبکدوشی حاصل کرلی ۱۹۵۲ء کے الیکشن میں شریک نہیں ہوئے اور جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے دہلی چلے گئے۔ چار سال خدمت انجام دینے کے بعد عمر کے تقاضوں سے مجبور ہوکر مستعفی ہو گئے اور عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور درس و تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔ امروہہ کے مدرسہ چلّہ میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے بلائے گئے چار سال وہاں مقیم رہے پھر آنند گجرات میں کم وبیش ۹ سال حدیث کے استاذ کی حیثیت سے قیام پذیر رہے آخر عمر میں وطن مالوف میں خاموشی کے ساتھ تصنیف و تالیف میں مصروف رہے تین کتابیں اردو میں ''مقامات تصوف'' تقلید ائمہ اور اخبار التنزیل۔ شائع ہو چکی ہیں۔ ۲۳ نومبر ۱۹۷۵ء کو سنبھل میں ہی راہی ملک بقا ہوئے اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔

چودھری محمد ریاست علی

سنبھل کے جاں باز سپوتوں وسرفروشوں میں چودھری محمد ریاست علی کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ان کا تعلق چودھری سرائے کے ایک معزز وذی حیثیت خاندان سے ہے ان کے والد ماجد چودھری ممتاز علی مسلم راجپوت تھے،اور عمائدین شہر میں شمار کئے جاتے تھے ۱۸۹۴ء میں ان کے گھر میں ایک ایسے لڑکے نے جنم لیا جو بعد میں چودھری محمد ریاست علی کے نام سے مشہور وممتاز ہوا۔ابتدائی تعلیم دستور زمانہ کے مطابق گھر پر ہی ہوئی ۔زمیندار گھرانے میں آنکھ کھولنے کے باعث اعلیٰ تعلیم سے محروم رہے۔عیش وعشرت کے ماحول میں پروان چڑھنے کے باوجود بچپن ہی سے وطن پرستانہ جذبات موجزن ہونے لگے تھے عمر کے ساتھ ساتھ نشہ حبّ قومی میں اضافہ ہوتا رہا۔بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں جب ان کی عمر بیس سال بھی نہیں ہوئی تھی ۔وہ میدان کارزار میں کود پڑے۔یہ وہ زمانہ تھا

جب سنبھل میں تحریک آزادی عہد طفلی سے عہد شباب میں داخل ہو رہی تھی ۔ لالہ روپ کشور، لالہ چندو لال، مولانا محمد اسماعیل، مولوی عبدالقیوم برطانوی سامراج کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے میں پیش پیش تھے اور یہاں کا گھر گھر متاثر ہو رہا تھا۔ برطانوی سامراج کے درندہ صفت نمائندے شمع آزادی کے پروانوں پر مظالم ڈھا رہے تھے ۔ سنبھل کے سر فروشان وطن بھی ان کی نگاہ میں بری طرح کھٹک رہے تھے ۔ ایک طرف جیالے سپوت مادر وطن کو برطانوی شکنجے سے آزاد کرانے کے لئے جان کی بازی لگائے ہوئے تھے تو دوسری طرف انگریز آقا انھیں تہیہ تیغ کرنے کی گھات میں تھے ۔ سنبھل کے مجاہدین آزادی بھی نشانہ بنے اور انھیں ان کے ارادوں سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی کی جانے لگی۔ ان پر ظلم وستم کے پہاڑ بھی توڑے گئے ۔ عیاری ومکاری سے بھی کام لیا گیا اور ہر وہ طریقہ اپنایا گیا جو ان کے راستے میں رکاوٹ بن سکتا تھا لیکن ہر کوشش ناکام ہوئی اور ہر حربہ بیکار گیا۔ مجاہدین آزادی کے پائے استقامت ڈگمگائے نہیں ۔ وہ نئی توانائی اور نئے عزائم کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ خلافت تحریک نے تحریک آزادی میں نئی روح پھونکی ۔ وہ تحریک جو چند سرفروشوں کی رہین منت تھی ۔ خلافت تحریک کے اثر سے عوامی تحریک بن گئی ۔ انگریز سے نفرت اور تحریک آزادی میں شمولیت کا جذبہ عام ہونے لگا ۔ انگریز آقاؤں نے جیل خانہ کا دروازہ کھول دیا۔

دوسرے مجاہدین آزادی کے ساتھ ساتھ چودھری محمد ریاست علی بھی سرگرم عمل تھے کبھی چھپ کر کبھی اعلانیہ بغاوت کے شعلوں کو ہوا دینے میں مصروف تھے کہ دستور ہند کی دفعہ ۱۷ کے تحت گرفتار کر لئے گئے اور مراد آباد جیل میں قید کر دیئے گئے ۔ ۱۸ اپریل ۱۹۲۲ء کو رہائی نصیب ہوئی رہا ہونے کے بعد وہ پھر اپنے مشن میں لگ گئے ۔ تحریک آزادی کو منظم کر

نے ، انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے آزادی بیدار کرنے کا کام جاری ہی تھا کہ ۲۶/اکتوبر ۱۹۲۳ء کو دوبارہ گرفتاری عمل میں آئی اور دو سال قید با مشقت کی سزا ملی۔ جیل میں بان بٹنے اور چکی پیسنے کا کام سپرد کیا گیا اور طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد چودھری محمد ریاست علی نے زمینداری سے کنارہ کشی اختیار کر کے فقیری لے لی اور زندگی کے آخری سانس تک قومی خدمات میں لگے رہے۔ ۱۹۶۹ء کی ۱۵/مارچ کو ۷۵/سال کی عمر میں شمع آزادی کا یہ پروانہ ابدی نیند سو گیا اور آبائی قبرستان میں اپنے دادا بہاء الدین کے پہلو میں سپرد خاک ہوئے چودھری سرائے میں واقع قبر پر تاریخ وفات کندہ ہے۔

مولوی سلطان احمد

مولوی سلطان احمد مرحوم سنبھل کے ان مجاہدین آزادی میں سے ایک تھے جنھوں نے ساری عمر ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بے نیاز ہو کر ملک وقوم کی خدمت کی اور گوشہ گمنامی میں جا پڑے۔ انھوں نے اس عہد کو زندگی کی آخری سانس تک نبھایا جو انھوں نے اپنے بزرگ مجاہدین تحریک آزادی سے بچپن میں کیا تھا۔ مولوی سلطان احمد کا تعلق قدیم ترک برادری سے تھا وہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں محلہ لودھی سرائے (دیپا سرائے) کے ایک ذی حیثیت گھرانے میں پیدا ہوئے والد کا نام جمیل احمد (مرحوم) ہے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم سنبھل میں ہی حاصل کی۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے قومی تحریک میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۳۰ء میں جمعیۃ علماء ہند نے شارداایکٹ کے خلاف امروہہ میں زبردست جلسہ منعقد کیا جس کی صدارت مولانا معین الدین اجمیری نے کی تھی اس جلسے کے بعد جس

میں سنبھل کے چند نوجوان شریک تھے، سنبھل میں کانگریس کا جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا جس میں ایک بندر کو سوٹ پہنا کر ایک آدمی کو گود میں بٹھا کر اور دونوں کو گدھے پر سوار کر کے شہر میں گھمانے کا پروگرام بنایا گیا ساتھ ہی گدھے پر ایک بورڈ لٹکانے اور اس پر وائسرائے کا آخری انجام لکھنے کی اسکیم تیار ہوئی۔ جلوس کی تیاری زور وشور سے ہوئی بڑوں نے سخت مزاحمت کی لیکن تقریباً ساٹھ کم عمر بچوں نے یہ مشکل کام انجام دیا قلمی اشتہار لکھے گئے اتفاق سے ایک پرچہ میونسپل بورڈ کے چیرمین کے ہاتھ لگ گیا۔ انھوں نے جلوس رکوانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن انہیں ناکامی ہوئی۔ جلوس کوتوالی کے سامنے سے ہوتا ہوا شہر کے بازاروں سے گزرا۔ ہر طرف تہلکہ مچ گیا اور تحریک میں نئی جان پڑ گئی۔ اس وقت تقریباً سو افراد گرفتار ہوئے۔ مولانا اسمٰعیل، حافظ نور الحسن، وغیرہم کے ساتھ ساتھ مولوی سلطان بھی پیش پیش تھے انھوں نے پولس کی مار بھی کھائی اور ہاتھا پائی بھی ہوئی وہ سخت زخمی ہو گئے چوٹ کے نشانات مرتے دم تک انگریزوں کے مظالم کی یاد دلاتے رہے۔ بعد ازاں مرحوم نے دہلی میں سکونت اختیار کی اور جمعیت علماء ہند کے دفتر میں فتویٰ نویسی اور مسجد خوں بہا میں قرآن کا درس دینے کا فریضہ انجام دینے لگے۔ اسی زمانے میں جمعہ کی نماز کے بعد جامع مسجد دہلی میں حکومت وقت کے خلاف پروپیگنڈا کرنا اور مسلمانوں کو تحریک آزادی میں شامل ہونے کی ترغیب دینا ان کے مشاغل میں شامل تھا جون ۱۹۳۳ء میں چیف کمشنر دہلی نے انھوں دہلی بدر کرنے کا حکم جاری کر دیا اور انھیں شام کو پولیس کی گاڑی میں بٹھا کر ۱۲ میل دور ایک ویران اور تاریک مقام پر چھوڑ دیا گیا۔ وہاں سے وطن واپس آئے اور دیہی وقصباتی علاقوں میں یہی فریضہ انجام دینے لگے۔ اور خاطر خواہ کامیابی حاصل کی۔

۱۹۳۷ء میں شہر کانگریس کے صدر منتخب ہوئے اپنے دور صدارت میں انھوں نے متعدد جلسوں کا انعقاد کیا جس سے مسلمانوں میں کانگرس کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔

انھوں نے کانگریس کے پلیٹ فارم سے ہندو مسلم اتحاد کی بے پایاں کوششیں کیں اور بڑی حد تک کامیاب ہوئے ان کی مساعی جمیلہ سے ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی جوق در جوق کانگریس میں شامل ہوکر تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لینے لگے۔

حصول آزادی کے بعد مرحوم نے گوشہ نشینی اختیار کرلی اور قرآن پاک کی تعلیم اور درس و تدریس کے فرائض انجام دینے میں مصروف ہو گئے اور یہ سلسلہ مرتے دم تک جاری رہا۔ سرگرم سیاست سے کنارہ کش ہونے کے باوجود وہ آخری دم تک کانگریس نظریات کے حامی و مبلغ رہے۔ ۱۵ راگست ۱۹۷۲ء کو وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی کے دست مبارک سے تامرپتر دیا گیا ۱۹۷۴ء میں مرکزی پینشن بھی منظور ہوئی۔ ۶ راگست ۱۹۸۵ء کو شہر کانگریس کمیٹی مرادآباد اور صوبائی صدر کانگریس کی جانب سے کانگریس کے جشن صد سالہ کے موقع پر پس از مرگ نشان یادگار سے نوازا گیا۔

مرحوم مولوی سلطان احمد دلکش اور وجیہہ شخصیت کے مالک تھے۔ منکسر المزاجی، شرافت نفسی، سادگی اور متانت کے پیکر، نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو کے آئینہ دار جرأت و بے باکی، صداقت شعاری اور صاف گوئی کے علمبردار مولوی صاحب ساری عمر سیاست کی نظر کرنے کے باوجود سیاست سے کوسوں دور تھے۔ وطن کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کا جذبہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھا۔ زندگی کے آخری ایام میں کافی کمزور ہو گئے تھے لیکن ان کے عزائم میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ظاہری کاموں اور سیاسی کاموں سے بہت دور رہتے تھے مذہبی و دینی فرائض کی انجام دہی کے بڑے پابند تھے، اور اسی کی تعلیم و ترویج میں مصروف رہتے تھے۔ ان کا حلقہ احباب میں بہت وسیع تھا لیکن تنہائی و گوشہ نشینی فطرت ثانیہ بن گئی تھی۔ تقریباً نصف صدی تک وطن عزیز کی گراں بہا خدمات انجام دینے کے بعد ۳ راگست ۱۹۸۴ء کو راہی ملک عدم ہوئے۔ اور آبائی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی نماز جنازہ اور

تدفین میں سرکاری نمائندے کی حیثیت سے تحصیل دار سنبھل کے علاوہ سرکردہ شہریوں کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ علاوہ ازیں صوبائی وزیراعلیٰ جناب نرائن دت تیواری نے اپنے تعزیتی پیغام میں ان کی وفات کو ملک وقوم کے لئے ایک عظیم نقصان قرار دیا۔

مولوی سلطان احمد کی زندگی یقین محکم اور عمل پیہم کا بہترین نمونہ تھی عہد طفلی سے عہد ضعیفی تک کی ان کی داستان حیات عزم واستقلال اور قربانی وایثار سے عبارت ہے انھوں نے اپنی نوجوانی کے زمانے میں وطن پرستی اور دیش بھگتی کی روح پھونکی اور انہیں مادر وطن کی خاطر جدوجہد کرنے کی ترغیب دی اور پوری زندگی ان اصولوں پر کاربند رہ کر نئی نسل کو وہ راہ دکھائی جس پر چل کر ملک وقوم کی پرخلوص اور بےلوث خدمات انجام دی جاسکتی ہیں۔

مفتی عبدالسلام سلاؔم

علامہ مفتی عبدالسلام سنبھل کے ان علمائے دین اور شاعروں میں سے تھے جن کو ادبی و علمی دنیا میں ایک ممتاز مقام حاصل تھا انھیں ہم عصر علماء میں اتنی شہرت وعزت حاصل تھی کہ ملک کے کونے کونے سے علماء اور طلباء ان کے پاس آتے اور مستفیض ہوتے انھوں نے ادب سماج اور مذہب کی بیش بہا خدمات انجام دے کر اپنا نام تو زندہ کیا ہی وہ حب الوطنی میں بھی کسی سے پیچھے نہ رہے ۔

مفتی صاحب شہر کے ایک ایسے معزز خاندان کے فرد تھے جس کا سلسلہ نسب شیخ حاتم ؒ سے جاملتا ہے تاریخ گواہ ہے کہ اسی خاندان کے لوگ شاہی زمانہ سے مفتی ہوتے آئے ہیں مفتی صاحب کی ولادت ۱۲۴۶ھ ہجری مطابق ۱۸۲۶ء میں ہوئی ۔ ان کے والد مفتی عبد القادر کا شمار باعزت شہریوں میں ہوتا تھا۔ مفتی عبدالسلام کی تعلیم ان کی ہی زیر نگرانی میں

ہوئی۔ابتدائی تعلیم کے بعد عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم حاصل کی۔اس کے بعد مذہبی تعلیم حاصل کی اور حدیث وفقہ وغیرہ میں اتنی مہارت حاصل کی کہ ان کا شمار استادوں میں ہونے لگا اور دور دراز سے طلباء تعلیم حاصل کرنے کے لئے ان کے پاس آنے لگے۔

ابھی مفتی صاحب تعلیم وتدریس (پڑھنے پڑھانے) میں منہمک ہی تھے کہ ملک میں برطانوی حکومت کے خلاف غصہ کی آگ بھڑک اٹھی اور آزادی کے متوالے سر سے کفن باندھ کر نکل پڑے تو مفتی صاحب بھی اپنے ضمیر کی آواز پر توجہ دیئے بنا نہ رہ سکے اور انھیں جب یہ خبر ملی کہ ان کے استاذ گرامی مفتی صدرالدین دہلوی کو ظالم انگریزوں نے شہید کر دیا۔تو مفتی صاحب کے غم واندوہ کی کوئی انتہا نہ رہی تو اانھونے انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔اور برطانوی حکمرانوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے اور لوگوں میں آزادی کے لئے لڑنے کا جوش پیدا کرنے کے لئے جامع مسجد سنبھل میں وقتاً فوقتاً جوشیلی و جذباتی تقریریں کیں۔ان کی تقریروں اور کارکردگیوں سے شہریوں میں آزادی کے لئے بیداری پیدا ہوئی اور گلی گلی انگریزوں کے خلاف نفرت کا غصہ پھوٹ پڑا۔گلی کوچوں اور چوراہوں پر مفتی صاحب کا یہ شعر بڑے بڑے حروف میں لکھا گیا۔

الٰہی خانۂ انگریز گر جا
یہ گر جا گھر، یہ گر جا گھر، یہ گر جا

انگریزوں کے خلاف نفرت کا بازار گرم کرنے اور تحریک آزادی کو عمل میں لانے کے ۔۔۔م میں مفتی صاحب کو مختلف طور سے پریشان کیا گیا انھیں جیل میں ڈال کر طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں جس کی ایک جھلک مفتی صاحب کے اس کلام سے ملتی ہے جو انھوں نے جیل ۔۔۔میں کہا تھا۔

دل ہجر سے نا شاد ہے ! یا مصطفیٰ فریاد ہے
فریاد ہے فریاد ہے یا مصطفیٰ فریاد ہے ،
سینے میں میرے تھی بھری ہر طرح کی پہلے خوشی
اب اس میں غم آباد ہے یا مصطفیٰ فریاد ہے

کہا جاتا ہے کہ جس دن مفتی صاحب کی پیشی تھی عادتاً سر سید حاکم سے ملنے آئے ان کے کہنے پر مفتی صاحب کو رہا کر دیا گیا۔ تقریباً ۷۳ رسال تک ملک وقوم، مذہب وسماج اور ادب کی گراں بہا خدمات انجام دینے کے بعد ۱۳۱۹ھ مطابق ۱۹۰۱ء میں خالق حقیقی سے جاملے۔

حافظ شیخ نورالحسن

حافظ نورالحسن سنبھل کے قدیم شیخ ترک خاندان سے تعلق رکھتے تھے ان کے والد کا نام شیخ امانت اللہ اور دادا کا اسم گرامی شیخ کریم اللہ تھا۔ یہ بڑے زمیندار گھرانوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ اجداد کا تعلق سنبھل سے پانچ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع موضع فیروز پور سے تھا۔ یہ موضع کسی زمانے میں تاریخی حیثیت کا حامل تھا۔ سوت ندی کے کنارے شمال کی جانب آباد اس خطے میں ایک قدیم قلعہ اور مسجد آج بھی اپنے شاندار ماضی کی داستان سنا رہی ہے حافظ جی کے بزرگ اسی فیروز پور سے ترک سکونت کر کے سنبھل کے محلہ میاں سرائے میں آباد ہوئے۔ شیخ امانت اللہ کے چار بیٹے ہوئے۔، نورالحسن سب سے چھوٹے تھے جو ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ خاندان میں مذہبی ودینی ماحول غالب تھا۔ دونوں بڑے بھائی بھی حافظ قرآن تھے انھوں نے بھی ابتدائی تعلیم اسلامی مدارس میں حاصل کی اور قرآن پاک حفظ کیا بعدازاں اردو فارسی کا مطالعہ بھی کیا تکمیل تعلیم کے دارج طے نہ کئے تھے اور سن بلوغ کا آغاز ہی تھا کہ مادرِ وطن کو غلامی کے آہنی شکنجے سے نجات دلانے کی تحریک سے متاثر

ہوئے اور مذہب وملّت کی خدمت کے ساتھ ساتھ آزادیٔ وطن کی خاطر سرگرم عمل ہو گئے اردو ان کی مادری زبان بھی تھی اور حریّت وانقلاب کی ترغیب وتحریک دینے کا ذریعہ بھی۔ راقم الحروف کے نام ایک تحریر میں انھوں نے لکھا ہے:۔

''میری سیاسی زندگی میں اردو زبان کو خاص دخل رہا ہے۔ اس کی ترقی کے لئے مالی امداد بھی کی۔ تحریک آزادی کے دور میں اردو میں سیاسی نظمیں لکھوائیں جو جلسوں میں پڑھی گئیں جو بہت باا ثر ثابت ہوئیں اور زبان زد خاص وعام ہوگئیں۔ میرے محلّے کے محترم بزرگ حاجی حافظ رحیم بخش تھے جنھوں نے ۱۹۳۰ء میں چند نظمیں لکھیں ایک نظم کے دو شعر یاد ہیں پیش کر رہا ہوں۔

الٰہی سلطنت برطانیہ برباد ہو جائے

غلامی دور ہووے ہند سے، آزاد ہو جائے

چلائیں گولیاں بے جرم ظالم نے پشاور میں

خدا غارت کرے بے کار تو حدّاد ہو جائے

یہی وہ انقلاب آخریں زمانہ تھا کہ جب دیگر سرفروشانِ سنبھل کے ساتھ حافظ نور الحسن بھی میدان عمل آئے ۔ ۱۹۳۰ میں جمعیت علماء کی جانب سے شاردا بل کے خلاف امروہہ میں ایک عظیم الشان اجلاس مولانا معین الدین اجمیریؒ کے زیر صدارت ہوا۔ جس میں مولانا عطاءاللہ شاہ بخاریؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ نے شرکت کی تھی حافظ جی اپنے رفقا کے ہمراہ اجلاس میں شریک ہوئے اور بل کی مخالفت میں جو قرارداد منظور ہوئی اس کو عملی جامہ پہنانے کا بیڑا اٹھایا۔ سنبھل میں حافظ نور الحسن اور ان کے نوجوان ساتھی کانگریس کی جڑیں مظبوط کرنے اور اس کا پیغام گھر گھر پہنچانے میں مصروف ہو گئے۔ ان نوجوانوں میں

پانچ ساتھیوں کے بارے میں ایک نظم گلی گلی گونج رہی تھی جس کا یہ شعر بہت مشہور ہوا۔

عزیز وافتخار،شبیر،سعادت،نور کے صدقے

بڑوں کوشرم آنا چاہئے ان پانچ کے صدقے

اسی مہم کے دوران ان لوگوں نے شہر میں کانگرس کا جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا۔ یہ کام آسان نہ تھا۔انگریز حاکموں کی نگاہیں تو ٹیڑھی ہی تھیں بعض اپنوں کا رویہ بھی معاندانہ تھا۔ یہ طے کیا گیا کہ ایک سوٹ پہنے ہوئے شخص کی گود میں ایک بندر بٹھا کراس کوگدھے پر سوار کیا جائے اورایک بورڈ پر" وائسرائے کا آخری انجام" لکھ کر جلوس کے ساتھ ساتھ گھمایا جائے ۔جلوس کی تیاری شروع ہوئی ،سو سے زائد جھنڈے تیار کئے گئے بندر پکڑ نے کی کوشش کی گئی تو نا تجربے کاری کی وجہ سے ناکامی ہوئی ایک لالہ جی سے بندر مانگا گیا چھوٹے رضا کارایک گدھا پکڑ لائے۔قلمی اشتہار لکھے گئے اور جلوس نکلنے کا بندوبست مکمل ہوگیا۔اسی اثنا میں ایک قلمی اشتہار چیئر مین کے ہاتھ لگ گیا انھوں نے برد بار لوگوں کو طلب کر کے جلوس نہ نکالنے کا حکم دیا۔ بزرگ ویسے ہی بہت کم تھے۔چیئر مین کا حکم ٹالنے کی مجال ان میں نہیں تھی لیکن نوجوانوں وبچوں کا جذبہ حریّت دبانے سے دبنے والا نہ تھا بمشکل دو بجے دن کوجلوس نکلا۔ بندراور گدھا شامل نہیں کئے جا سکے۔تقریبا ساٹھ بچے اورنوجوان کا رواں لے کر چلے انگریزوں کے خلاف نظمیں پڑھی گئیں۔ نظم خوانی میں محمد اسمٰعیل نے جو بعد میں مولانا محمد اسماعیل کی حیثیت سے مشہور ہوئے مرکزی رول ادا کیا۔جلوس کوتوالی کے سامنے سے ہوتا ہوا چیئر مین صاحب کے دولت کدے کے سامنے سے بھی گذرا۔نوجوان مجاہدین آزادی اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے ۔آزادی کی لوتیز ہوئی کانگریس کی تحریک کو جلا ملی اورآزادی وطن کے جذبات بیدار کرنے اور غلامی کے خلاف خبردآزما ہونے کا پیغام

گھر گھر پہنچانے کی غرض سے کانگریس کے بڑے بڑے جلسوں کا انعقاد ہوا جن میں انگریزوں کے خلاف پرجوش تقریریں کی جاتی تھیں اور وطن کی خاطر میدان عمل میں آنے کی تلقین کی جاتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سنبھل تحریک آزادی کا سرگرم مرکز بن گیا۔ اور انگریز حکام بدلے وانتقام کی آگ میں جلنے لگے۔ اسی سال شیخ نورالحسن کو گرفتار کرلیا گیا۔ سبب یہ تھا کہ انھوں نے بہت بڑے جلوس کی رہنمائی کی جو کوتوالی تک گیا۔ ہجوم نے ان سے تقریر کرنے کی فرمائش کی کوتوال اس مانگ کے خلاف تھا اس نے ہجوم پر لاٹھی چارج کا حکم دے دیا۔ مار پیٹ کی نوبت آگئی۔ حکومت نے اس واقعہ کو بلوہ قرار دے کر اور غدّاری کا الزام لگاتے ہوئے اندھا دھند گرفتاریاں شروع کردیں تین سو سے زائد افراد گرفتار کیے گئے۔ نورالحسن صاحب کو معافی مانگنے پر مجبور کیا گیا۔ لیکن انہوں نے ہر ظلم سہا پر معافی نہیں مانگی۔ مقدمات میں پھنسا دیئے گئے اور چھ ماہ کی سزا نیز پچاس روپیہ کا جرمانہ عائد کیا گیا۔ اس کے علاوہ بلوہ کرانے کے جرم میں چار ماہ کی سزا بھی دی گئی شیخ نورالحسن کو C کلاس میں رکھا گیا اور سخت محنت ومشقت کے کام لئے جاتے تھے۔

سزا کی مدّت گزرنے کے بعد حافظ جی کے "ذوق گنہ" میں اور اضافہ ہوا۔ وہ ہر مشکل کا سامنا کرتے اور آزمائش پر پورے اترتے اپنے مشن کی تکمیل میں لگے رہے۔ ۱۹۴۲ء کی تحریک میں انھیں ڈیڑھ سال کی سزا ہوئی اور دو سو روپے کا جرمانہ ہوا۔ اس بار انھیں B کلاس دیا گیا۔

حصول آزادی کے بعد حافظ نورالحسن نے خوددار تنہائی پسند اور بے غرض مجاہدین وطن کی طرح عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ جب تک سرگرم ومخلص کارکنوں کو یاد کیا جاتا رہا انکی بھی پذیرائی ہوئی۔ وہ تقریباً دس سال تک ضلع پریشد کے رکن اور شہر کانگرس

کمیٹی کی مجلس عاملہ کے ممبر رہے۔ اتر پردیش سرکار نے انھیں سیاسی پنشن بھی دی اور تامر پتر بھی۔ مرکزی حکومت کی طرف سے بھی پنشن دینے کا فیصلہ ہوا جو تا حیات جاری رہا۔

تحریک آزادی میں سرگرم شرکت وقیادت کے ساتھ ساتھ حافظ نورالحسن نے دین ومذہب کی خدمت میں کوئی کوتاہی نہیں برتی۔ انھوں نے نصف صدی قبل میاں سرائے میں ایک مکتب ''حمایت الاسلام'' کے نام سے قائم کیا تھا مکتب میں دینی ومذہبی تعلیم کے علاوہ اردو پڑھانے کا انتظام بھی کیا مرحوم آخری عمر تک مکتب کے مہتمم کی حیثیت سے دینی تعلیم کے فروغ میں لگے رہے۔

حافظ نورالحسن منکسر المزاج، پابند صوم وصلوٰۃ اور نیک نفس انسان نیز سچے باعمل و مخلص محب وطن مسلمان تھے۔ ان کی داستان حیات قربانی وایثار، خلق وخدمت دین اور وطن پرست جذبات سے عبارت ہے وہ جب تک جیئے قوم وملک کے لئے جیئے۔ اور آخری سانس تک اسی روش پر قائم رہے کچھ عرصہ بیمار رہنے کے بعد ۶ رنومبر بروز اتوار ۱۹۸۹ء کو فرشتہ اجل کو لبیک کہا دوشنبہ ۷ رنومبر کو سپرد خاک ہوئے اور سینکڑوں سوگواروں نے بادیدہ نم انھیں رخصت کیا۔

''حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا''

مولانا عبدالقیّوم سنبھلی

مولانا عبدالقیوم سنبھل کے قدیم ترین ترک خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ سلطان التمش کے قلعہ سنبھل کے شمالی علاقہ میں ترکوں کی گھنی آبادی ہے یہیں ۱۹۰۶ء میں مولانا کی پیدائش ہوئی۔ والد کا نام منشی کفایت اللہ تھا۔ مولانا عبدالقیوم ابھی ۸؍برس کے ہی تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والدہ ماجدہ قمرالنساء صاحبہ نہایت دیندار، متقی، پرہیز گار اور روشن خیال خاتون تھیں ملک وقوم کی خدمت کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اپنے بچوں کو بھی انھوں نے یہی تعلیم دی۔ بڑے بیٹے مولانا اسمٰعیل بھی قابل فخر مجاہد آزادی تھے، وہ ممتاز عالم دین اور سرگرم سیاسی رہنما تھے۔ مولانا اسمٰعیل جمعیت علماء ہند کے اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز ہوئے۔ ریاستی اسمبلی کے ممبر بھی چنے گئے تھے متعدد کتابوں کے مصنّف بھی تھے اور بہترین مقرر وخطیب بھی۔ قومی خدمات کے اعتراف میں انھیں ریاستی حکومت کی جانب سے تامر پتر بھی دیا گیا تھا۔ مولانا عبدالقیوم والدہ ماجدہ اور بڑے بھائی

کی نگرانی میں پروان چڑھے۔ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔پھر مشہور مدرسہ سراج العلوم ہلالی سرائے میں داخل ہوئے ۔ بعد ازاں مراد آباد کے مشہور و معروف مدرسہ شاہی قاسم العلوم میں تعلیم پائی ۔ ۱۹۲۰ء میں جب مولانا کی عمر صرف چودہ سال کی تھی مراد آباد کے ہندو کالج میں مہاتما گاندھی اور مولانا محمد علی جوہر نے خطاب کیا تو وہ بھی ایک طالب علم کی حیثیت سے جلسہ میں شریک تھے۔یہیں سے ان کے دل میں تحریک آزادی میں سرگرم حصہ لینے کا جذبہ بیدار ہوا اور وہ ملک کو غلامی کے آہنی شکنجے سے نجات دلانے کیلئے میدان عمل میں آ گئے ۔مولانا محمد علی کی تقریر سننے کا ہی اثر تھا کہ وہ اسی دن سے مراد آباد، کاشی پور اور قرب و جوار کے علاقوں میں جوشیلی تقاریر کے ذریعہ عوام میں جذبہ حب قومی بیدار کرنے لگے۔ان کی پُر اثر تقاریر اور جوش عمل کے نتیجے میں ہزار ہا افراد تحریک میں شامل ہو گئے ۔ ۱۹۲۱ء میں وطن واپس آکر باقاعدہ علم بغاوت بلند کر دیا اور یہاں کی سڑکوں، چوراہوں اور عوامی مقامات پر حکومت مخالف تقاریر کر کے تحریک آزادی کو عوامی بنانے کے کام میں جٹ گئے ۔سینکڑوں فدائیان وطن میدان کارزار میں نکل آئے لالہ چندو لال، ماسٹر روپ کشور، چودھری محمد ریاست علی اور مولانا محمد اسمٰعیل کی رہنمائی میں سنبھل میں تحریک آزادی زور پکڑ گئی۔ ۱۹۲۲ء میں ان چاروں اصحاب کو دو سال کے لئے مراد آباد جیل میں قید کر دیا گیا۔ اس وقت سنبھل میں تقریباً ۵ ہزار والینٹر قومی تحریک میں شامل تھے اور مولانا عبد القیوم ان کی رہنمائی کر رہے تھے۔چوراچوری واقعہ کے بعد مہاتما گاندھی نے تحریک واپس لے لی اور مولانا تکمیل تعلیم میں جٹ گئے ۔ ۱۹۲۴ء میں دہلی کے مدرسہ فتح پور مسجد میں داخل ہوئے اور چار سال میں فراغت حاصل کر کے وطن واپس آ گئے ۔ ۱۹۲۹ء میں وہ پھر عملی جہاد میں شریک ہوئے اور نیشنل کانگریس کی تنظیمی ذمہ داریاں سنبھال لیں ۱۹۳۰ء میں منشی

معین الدین انصاری جن کے دادا منشی امام الدین ہادی کو ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے دوران بہادر شاہ ظفر کی مدد کرنے کے جرم میں چونے کی بھٹی میں جھونک دیا گیا اور مولوی عبدالوحید مرحوم، پنڈت واسودیو رگھونندن شرما، حافظ نورالحسن، ہر پرشاد وکیل، رام رتن، پنڈت پرہلاد کمار جیسے معروف معززین شہر بھی تحریک کے سرگرم کارکن بن گئے۔ ۱۲ر ستمبر ۱۹۳۰ء کو مولانا عبدالقیوم اور لالہ چندو لال کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا اور چھ ماہ کی سزا ہوئی۔ ۹ر مارچ کو گاندھی اروِن معاہدے کے تحت رہا کر دئے گئے۔ اس تحریک کے دوران سنبھل میں سینکڑوں افراد گرفتار کئے گئے۔ ان پر لاٹھی چارج بھی کیا گیا تھا، میاں سرائے کے ایک مجاہد بشیر احمد کو شہادت بھی نوش کرنا پڑا۔ سینکڑوں بے خانماں و برباد ہوئے۔ رہائی کے بعد مولانا نے معاشی مسائل کی طرف توجہ دی۔ ۱۹۳۴ء میں مدرسۃ المحمدیہ سنبھل میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور کانگریس کی تشکیل و تنظیم میں بھی کوشاں رہے۔ ۱۹۳۴ء میں ہی ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے ہمراہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لئے چندہ مہم میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ ۱۹۳۵ء میں کانگریس کی پولیٹیکل کانفرنس میں جسکی صدارت پنڈت گووند بلبھ پنت نے کی تھی، خطبہ استقبالیہ پڑھا۔ ۱۹۳۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان ہوئے تاریخ ساز الیکشن میں بہت کام کیا۔ بلاری حلقہ کا انتظام انہیں کے ذمّہ تھا۔ انھوں نے دن رات ایک کر کے کانگریس کے حق میں فضا ہموار کی اور کانگریس کے امیدوار مولانا اسمٰعیل کو کامیاب بنانے میں اہم رول ادا کیا۔ ۱۹۳۹ء میں ضلع کانگریس کمیٹی کی تنظیمی ذمّہ داریوں کو نبھانے کے لئے مرادآباد منتقل ہو گئے۔ ۱۹۴۰ء میں تحریک کے دوبارہ شروع ہونے پر سرگرم عمل ہو گئے اس وقت مولانا ضلع کانگریس کے آفس سکریڑی تھے ۱۹۴۱ء میں ڈکٹیٹر مقرر ہو گئے اور پروفیسر رام سرن، پنڈت شنکر دت، داؤ دیال کھنّہ، لالہ رام غلام چودھری شیو

سروپ،سنگھ،مولانا سید محمد میاں،کامریڈ ابراہیم،قاری عبداللہ وغیرہم کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔انفرادی ستیہ گرہ کے سلسلہ میں مولانا کو بعض بعض دفعہ تین تین چار چار میل تک پیدل سفر کرنا پڑتا تھا۔لیکن وہ کبھی ہراساں نہیں ہوئے۔۲۲رفروری کو انھیں بھی ڈی.آئی.آر کے تحت چھ ماہ سخت قید ۳۵ر روپیہ جرمانہ کی سزا ملی اور ۲۶رفروری کو بریلی جیل بھیج دیئے گئے۔ جولائی ۱۹۴۱ء میں رہائی نصیب ہوئی۔جیل سے آنے کے بعد پھر تنظیمی سرگرمیوں میں مصروف ہوئے۔اگست ۱۹۴۲ء ''انگریزوں بھارت چھوڑو تحریک'' میں ضلع کی رہنمائی ان کے سپرد ہوئی۔ وہ زیر زمین ہوکر رہنمائی کرتے رہے۔اسی دوران ان کی بہادر ماں کا انتقال ہو گیا۔ بڑے بھائی مولانا محمد اسمٰعیل ۹راگست کو ہی نظر بند ہو چکے تھے اور وہ خود روپوش ہوکر رہنمائی کر رہے تھے۔دونوں بیٹے ماں کی تدفین میں شریک نہیں ہو سکے۔یکم ستمبر ۱۹۴۲ء کو سنبھل ریلوے اسٹیشن پر گاڑی کا محاصرہ کر کے مولانا کو گرفتار کرلیا گیا اور ڈی.آئی.آر کے تحت مرادآباد جیل میں نظر بند ہوگئے۔مرادآباد ڈسٹرکٹ جیل اس وقت ممتاز مجاہدین ورہنماوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔وہاں مولانا حسین احمد مدنی، حافظ محمد ابراہیم،مولانا حفظ الرحمٰن،مولانا محمد میاں جیسے مشاہیر کی رفاقت نصیب ہوئی۔۱۴ر ماہ کی نظر بندی کے بعد دسمبر ۱۹۴۳ء میں سبھی کو رہا کردیا گیا۔رہائی کے بعد مولانا پھر کانگریس کی تنظیمی ذمہ داریوں کو نبھانے میں لگ گئے۔ ۱۹۴۵ء میں کانٹھ میں سیوادل ٹریننگ کیمپ میں شامل ہوئے۔۱۹۴۶ء میں کانگریس کی انتخابی سرگرمیوں میں مصروف ہوئے اور کانگریس کے بلاری حلقہ کے انچارج بنائے گئے۔۱۹۴۷ء میں حصول آزادی کے بعد کانگریس کے حق میں فضا سازگار کرنے اور فرقہ پرستی کی طوفانی لہروں کو ختم کرنے کے لئے میدان عمل میں آئے۔اسی دوران صوبہ کانگریس کمیٹی کے رکن چنے گئے اور ۱۹۵۵ء تک مختلف حیثیتوں

سے کام کرتے رہے۔ وہ بھودان تحریک کے رکن بھی ہوئے۔ پارٹی کے مختلف عہدوں پر بھی فائز ہوئے اور عام کارکن کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔ ہر طرح کے حالات کا سامنا کیا۔ کانگریس مخالف عناصر کے ساتھ ساتھ، کانگریس میں گھسے ہوئے فرقہ پرست عناصر کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ متعدد بار ناخوش گوار حالات اور نامساعد ماحول کا بھی سامنا کرنا پڑا لیکن ماتھے پر شکن نہیں آئی۔ قومی وملکی کاموں اور تحریک آزادی میں سرگرم حصّہ لینے کی وجہ سے کبھی گھر کے مسائل کی طرف توجہ نہ دے سکے۔ گھر میں ناگفتہ بہ حالات بھی پیدا ہوئے سخت مرحلے بھی آئے۔ لیکن ان کی بہادر ماں اور وطن پرست بیوی نے زبان سے اُف تک نہ کی ۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۸ء کے صبر آزما حالات میں ماں نے رات دن چرخا کات کر گھر کا خرچ چلایا اور بچوں کی تعلیم کی طرف بھی توجہ دی۔ ۱۹۲۸ء سے مولانا کی رفیقہ حیات بھی انھیں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مصروف کار رہیں۔ ۱۹۴۲ء کے بعد سے تنہا ہی گھریلو مسائل اور ذمہ داریوں سے نبرد آزما ہیں اور بچوں کی نگہداشت، شوہر کی دیکھ بھال اور مجاہدین کی امداد کیلئے خود کو لگائے رہیں۔ ساری ساری رات چرخا کات کر گزارتیں اور دن میں بچوں کی تربیت ونگہداشت میں مصروف رہتیں۔ مولانا کی عدم موجودگی کی وجہ سے سخت حالات سے دوچار ہونا پڑتا۔ لیکن حرف شکایت زبان پر نہ لاتیں۔ ایک وقت تو وہ بھی آیا کہ اچھے اچھوں کے قدم ڈگمگا جاتے۔

مولانا کے چار بچے ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۶ء کے دوران صحیح علاج معالجہ نہ ہونے کی وجہ سے راہی ملک عدم ہوئے۔ ایک بچی کی عمر تو گیارہ برس تھی ان صدمات کو بھی صبر و ضبط کے ساتھ برداشت کیا اور پوری توجہ ان دو بچوں کی تربیت وتعلیم پر دی۔ لڑکا جس کی پیدائش ۱۹۳۵ء میں ہوئی حصول تعلیم کے بعد برسر روزگار ہو گیا اور لڑکی جو ۱۹۴۶ء میں پیدا

ہوئی بی.اے. بی.ایڈ کرنے کے بعد درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔

۱۹۷۲ء میں مولانا عبدالقیوم حج بیت اللہ سے بھی فیضیاب ہوئے ۷۶/سال کی عمر میں بھی مولانا کے معمولات میں فرق نہیں آیا گرچہ وہ زیادہ وقت عبادت وریاضت میں صرف کرتے تھے۔ لیکن ان میں جوانوں سے زیادہ حوصلہ اور کام کرنے کی لگن تھی۔ قومی تقریبات میں وہ جوش وخروش سے شریک ہوتے تھے۔ اور پر جوش خطابت سے محفل کو گرما دیتے تھے۔ مولانا عبدالقیوم نہایت خود دار وضعدار تھے۔ نمود نمائش اور حصول اقتدار سے دور رہتے تھے۔ ۱۹۵۶ء میں ریاستی حکومت نے انہیں ۲۵/روپیہ ماہوار سیاسی پنشن دینا مظور کی تھی ۱۹۷۴ء سے مرکزی حکومت کی جانب سے بھی سیاسی پنشن ملنے لگی تھی یہی ان کا ذریعہ معاش تھا اور یہی سرمایہ۔ جنوری ۱۹۷۴ء میں انھیں ریاستی حکومت کی جانب سے مجاہد آزادی کا تامر پتر بھی دیا گیا۔ مولانا عبدالقیوم ۸۸/سال ملک اور قوم کی بیش بہا خدمات انجام دے کر ۲۶/دسمبر ۱۹۹۴ء کو اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ آبائی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

مولانا عبدالقیوم کی داستان حیات جتنی عبرت خیز ہے اتنی ہی سبق آموز بھی۔ یہ ہماری کتنی بدنصیبی ہے کہ جن لوگوں نے ملک وقوم کی سچی خدمت کی ہے اور بے مثال قربانیاں دی ہیں انہیں فراموش کر دیا گیا ہے۔

اُدے پال گپتا

تحریک آزادی میں سنبھل کی حمایت کی تاریخ نہ تو اتنی آسان اور مختصر ہے جس کو مکمل طور پر قلم بند کیا جا سکے اور نہ ہی اتنی معمولی کہ جسے آسانی سے نظر انداز کیا جا سکے ۔تحریک آزادی سے پیشتر نہ معلوم کتنے سنبھل کے وطن پرستوں نے اپنی جانوں کی قربانیاں دیں لیکن منشی امام الدین ہادیؔ کے علاوہ کسی کا حوالہ نہیں ملتا۔اسی طرح بیسویں صدی کے شروع سے ۱۹۴۷ء تک سینکڑوں نوجوانوں اور وطن پرستوں نے غیر ملکی حکومت کے خلاف تحریک میں حصہ لیا اور ہر طرح کی قربانی دینے میں پیش پیش رہے لیکن بیس پچیس ناموں کے علاوہ دیگر وطن پرستوں کے نام اور ان بہادروں کے کارنامے تاریخ کے اوراق سے غائب ہو گئے۔افسوس کہ بیس پچیس مجاہدین میں بھی جن کا حوالہ ملتا ہے ان کی تعداد بھی پندرہ سولہ سے زیادہ نہیں ہے اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ نہ تو سنبھل کی تاریخ خصوصاً تحریک آزادی کی تاریخ پر کچھ لکھا گیا اور نہ ہی مجاہدین آزادی کے قریبی رشتہ دار اور دوست اپنے

بزرگوں کا حوالہ دینے میں فراغ دلی کا ثبوت دیتے ہیں نتیجتاً بہت سے مجاہدین کا تعارف نامکمل رہ گیا۔

اُدے پال گپتا مرحوم کا شمار ان مجاہدین میں سے ہیں جن کی خدمات تو بے شمار ہیں لیکن ان کا حوالہ اور سوانح حیات نامکمل اور غیر اطمینان بخش ہے۔ ادے پال گپتا مرحوم کی پیدائش جرگاؤں چندوسی میں ۱۹۰۹ء میں ہوئی ان کے والد رگھوور دیال گپتا جرگاؤں کے معزز لوگوں میں سے تھے۔ اُدے پال گپتا نے درجہ پانچ تک کی تعلیم اپنے پیدائشی مقام جرگاؤں میں حاصل کی اور اس کے بعد چندوسی چلے گئے اور وہیں سے ہائی اسکول پاس کیا

اُدے پال گپتا ابھی طالب علم ہی تھے کہ ملک کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کی تحریک سے متاثر ہوئے اور ہائی اسکول کا امتحان دینے کے بعد سرائے ترین سنبھل چلے آئے اور سماجی وقومی خدمات میں لگ گئے۔ تحریک آزادی نے جب زور پکڑا تو وہ بھی ایک سچے دلیر وطن پرست سپاہی کی طرح میدان میں کود پڑے اور اپنے کارناموں سے انگریز حاکموں کی نیند حرام کر دی۔

۹ر مئی ۱۹۴۱ء کو انہیں دفعہ ۳۸/۳۴ کے تحت چار ماہ کی قید بامشقت اور ۲۰ر روپیہ جرمانہ دینے کی سزا دی گئی اور مراد آباد جیل بھیج دیا گیا۔ مراد آباد جیل میں دیگر مجاہدین کی طرح اُدے پال گپتا کو بھی مختلف طور سے اذیتیں دی گئیں۔ ستمبر ۱۹۴۱ء کو انھیں رہا کر دیا گیا۔ رہا ہونے کے بعد زندگی کے آخری لمحات تک وہ قومی وسماجی خدمات میں لگے رہے۔

تقریباً ۷۳ر برس کی عمر میں ۱۴ر اگست ۱۹۸۲ء کو تحریک آزادی کا یہ پروانہ زندگی کے شکنجے سے چھٹکارا پا گیا۔

چیتن سروپ رستوگی

ہندوستان کو غلامی کے آہنی شکنجے سے آزاد کرانے والے سنبھل کے بہادر اور جفا کش مجاہدین میں مرحوم چیتن سروپ رستوگی کا نام سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔اپنے دیگر ساتھیوں مولانا محمد اسمٰعیل چودھری محمد ریاست علی، پنڈت واسودیو وغیرہ کی طرح چیتن سروپ رستوگی نے بھی ملک کی عزّت اور اس کی آزادی کیلئے نا قابل برداشت اذّیتیں برداشت کیں اور تحریک آزادی کی تاریخ میں اپنا نام نمایاں کرلیا۔

قصبہ سرسی کے گاؤں محمود پور میں سنہ ۱۹۱۰ میں پیدا ہوئے چیتن سروپ رستوگی کے والد اند ر سروپ رستوگی مرحوم کا شمار معزّ ز حضرات میں ہوتا تھا ۔ وہ کسی سبب سنہ ۱۹۲۴ یا ۱۹۲۵ء میں سنبھل آگئے۔چیتن سروپ رستوگی نے ابتدائی تعلیم دستور کے مطابق حاصل کی اور ہائی اسکول کا امتحان ایس ایم ہائی اسکول چندوسی سے پاس کرنے کے بعد ملک کی خدمت میں لگ گئے۔

چیتن سروپ رستوگی کے فرزند جناب رمیش چندر رستوگی کے مطابق ان کے والد جناب چیتن سروپ رستوگی نو جوانی میں ہی قومی خدمات وتحریک آزادی میں سرگرم حصہ لینے لگے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں سینئر مجاہدین آزادی پنڈت واسودیو (محمود پور والے) اور لالہ چندولال (سرسی والے) سے وابستہ ہو گئے اور ان کی پر جوش تقاریر اور انگریزوں کے خلاف کارناموں سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور غیر ملکی حکومت کی جڑوں کو اکھاڑ پھینکنے کے لئے سرگرم ہو گئے ۔انگریز سرکاران کے خلاف کارروائی کرنے کے بہانے ڈھونڈ نے لگی ۔ ۱۹۴۰ء میں انہیں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ جہاں انھیں سخت محنت کرنے پر مجبور

کیا گیا اس وقت وہاں پنڈت درباری لال شرما' چودھری بدن سنگھ، مولانا حفظ الرحمٰن سیو ہاروی جیسے باعزّت مجاہدین آزادی بھی موجود تھے۔

تقریباً انھیں ایک سال بعد رہا کیا اور وہ پھر پہلے سے زیادہ مستحکم اور سچائی کے ساتھ تحریک کو کامیاب کرنے میں لگ گئے۔ ۱۹۴۲ء میں انھیں دوبارہ گرفتار کر کے مرادآباد جیل میں قید کیا گیا اور پہلے کی طرح اذّیتیں دی گئیں مرادآباد جیل میں انھیں چودھری شوسروپ سنگھ، جگدیش پرساد، لالہ رام غلام اور داؤ دیال کھنہ جیسے سینئر مجاہدین کے قریب آنے کا موقع ملا۔ ان لوگوں کو جیل میں سکنڈ کلاس میں رکھا گیا اور سخت محنت کرنے پر مجبور کیا گیا۔

۱۹۴۶ء میں جب پنڈت جواہر لال نہرو سنبھل آئے تو ان کی عزّت افزائی میں عام جلسہ کا انعقاد کرنے اور لوگوں میں قومی بیداری پیدا کرنے میں لالہ چیتن سروپ رستوگی نے اہم رول ادا کیا۔

۱۹۴۷ء میں مجاہدین آزادی کا خواب پورا ہوا اور ملک آزاد ہو گیا۔ حصول آزادی کے بعد زیادہ تر مجاہدین نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کی لیکن چیتن سروپ رستوگی آزادی کے بعد بھی سیاسی میدان میں کام کرتے رہے۔ وہ شہر کانگریس کے سکریڑی بھی منتخب ہوئے اور صدر کے عہدہ پر بھی فائز رہے۔ ۱۹۴۸ء میں ضلع پریشد کے رکن بھی بنائے گئے۔ اور نائب صدر بھی منتخب ہوئے ان سبھی عہدوں پر رہتے ہوئے انھوں نے کانگریس اور عوام کی بے بہا خدمات انجام دیں اور یہ سلسلہ زندگی کے آخری لمحات تک جاری رہا۔

۲۱ ر کتوبر ۱۹۷۱ء کو ۶۴ ر برس کی عمر میں تحریک آزادی کا یہ قابل فخر آزادی کا سپاہی اس دنیا کو چھوڑ کر چلا گیا۔

پنڈت جے نرائن شرما

۱۸۵۷ء کی انقلابی تحریک کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ اس تحریک کے پرچم تلے سبھی مذہب، قوم اور فرقوں کے لوگ جمع تھے اور قومی یکجہتی کی ایسی مثال قائم کی جس پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک جتنی بھی تحریکیں چلیں یہ رواج پورے طریقے سے جاری رہا۔ پھوٹ ڈالنے اور نفاق پیدا کرنے کی انگریز حکمرانوں کی کوئی چال کارگر ثابت نہ ہوسکی۔ مثال کے طور پر عدم تعاون تحریک اور خلافت تحریک کی تاریخ ہمارے سامنے ہے، جس میں سبھی مذاہب کے لوگوں نے کاندھے سے کاندھا ملا کر حصّہ لیا اور ملک کی آزادی کے لئے ہر طرح کی قربانیاں دیں۔

سنبھل میں بھی تحریک آزادی کی یہی شکل سامنے آئی یہاں کے وطن پرستوں نے جن میں سبھی مذاہب کے ماننے والے تھے اتحاد و اتفاق کے ساتھ تحریک آزادی کو آگے

بڑھانے میں اہم رول ادا کیا۔ ایک طرف منشی امام الدین ہادی، مولانا غلام رسول، قاری عبدالحق، منشی معین الدین، مولانا اسمٰعیل اور چودھری محمد ریاست علی جیسے سچّے مذہبی لوگ ملک کی آزادی کے لئے جہاد کر رہے تھے تو دوسری طرف پنڈت واسو دیو، لالہ چیتن سروپ، پنڈت جے نرائن شرما وغیرہ بھی اپنے فرائض نبھانے میں کسی سے پیچھے نہ رہے۔

جناب ٹیکا رام شرما کے فرزند پنڈت جے نرائن شرما ۱۸۹۷ء میں سنبھل سرائے ترین میں پیدا ہوئے۔ ابھی وہ ابتدائی تعلیم حاصل کر پائے تھے کہ قومی وسماجی کاموں میں دلچسپی لینے لگے۔ تحریک آزادی سے وہ اتنا متاثر ہوئے کہ انھوں نے اسے ہی اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔ اپنے مقصد کی ذمہ داری کو نبھانے میں وہ اتنے محو ہو گئے کہ انھوں نے اپنی تعلیم اور مستقبل پر کوئی غور نہیں کیا۔ اور نہ انھوں نے شادی کی وہ زندگی بھر ملک کی خدمت اور سماجی کاموں لگے رہے۔

برطانوی حکومت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے، ملک کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے اور عام لوگوں میں انقلابی خیالات کو پھیلانے کے لئے انھوں نے بہت ہمت اور ایمانداری کا ثبوت پیش کیا۔ غیر ملکی حکمرانوں نے دوسرے مجاہدین آزادی کی طرح ان پر کڑی نظر رکھی اور انھیں سزا دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ انھیں چار مرتبہ گرفتار کیا گیا اور لکھنؤ۔ مرادآباد اور بریلی کی جیلوں میں قید کیا گیا اور انھیں اذیتیں دی گئیں۔ شرما جی کی پہلی گرفتاری ۲۵ر جنوری ۱۹۴۱ء میں ہوئی اور انھیں ایک سال کی قید بامشقت اور ۲۵ر روپیہ کا جرمانہ کیا گیا۔ دیگر گرفتاریوں کے دوران بھی اسی طرح کی سزائیں دی گئیں۔ بریلی جیل میں جرمانہ ادا نہ کرنے پر ان کا مکان ضبط کر لیا گیا۔

اذیتیں، سزائیں، گرفتاریاں اور مظالم بہادر جے برائن شرما کو منحرف نہ کر سکے۔

ہر سزا کے بعد ان کے حوصلے اور جذبات بڑھتے گئے اور وہ مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے سرگرم عمل رہے۔ ان کے کام کرنے کی لگن دانش مندی اور جوش کو دیکھ کر ہی انھیں مجاہدین آزادی کی اوّل صف میں مقام ملا۔ وہ متعدد مرتبہ تحصیل و بلاک کی تحریک کے صدر منتخب ہوئے اس ذمہ داری کو انھوں نے دانش مندی کے ساتھ نبھایا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی سنبھل میں آمد پر بھی جے نرائن شرما نے اہم رول ادا کیا اور جلسہ سے خطاب کیا اور اس کو کامیاب بنانے میں خصوصی طور سے حصہ لیا۔ ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد کرانے کا ان کا خواب تو پورا ہو گیا لیکن حصولِ آزادی کے بعد وہ زیادہ مدّت تک زندہ نہ رہ سکے اور ۵۱ر برس کی مختصر عمر میں زندگی کی قید سے چھٹکارا پایا۔

مہاشیے پیارے لال

جب مہاتما گاندھی کی زیرِ سرپرستی پورے ملک میں برطانوی حکمرانوں کو نکال باہر کرنے کی تحریک عمل میں آئی اور محبِ وطن غلامی کے آہنی شکنجے سے نجات دلانے کے لئے سر سے کفن باندھ کر میدان میں آ گئے اور ملک کے کونے کونے میں ''انقلاب زندہ باد'' کے نعرے گونج اٹھے تو تاریخی شہر سنبھل کے بہادر سپوتوں نے تن من دھن سے ملک کو آزاد کرانے کا پختہ ارادا کر لیا۔ شہر و تحصیل میں ہی نہیں سنبھل کے دیہی علاقوں میں بھی تحریک آزادی کی آگ بھڑک اٹھی۔ سرسی، اسمولی سنگھ پور رٹھالی وغیرہ کے بے شمار مجاہدین آزادی نے اہم رول ادا کیا۔ یہی نہیں دیگر مقامات اور علاقوں کے وطن پرستوں نے سنبھل آ کر تحریک آزادی میں خصوصی حصہ لیا۔ باہر سے آ کر سنبھل میں تحریک آزادی میں شامل ہونے اور سرگرم حصہ لینے والے بہادر سپوتوں میں ایک اہم نام مہاشیے پیارے لال کا بھی ہے جن کی حب الوطنی قربانیاں اور خدمات ہمیشہ یاد کی جائیں گی۔

مہاشیے پیارے لال تحصیل اترولی ضلع علی گڑھ کے گاؤں کاظم آباد کے باشندے تھے ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ پیارے لال کے والد مرحوم لیلا دھر پوت دار ایک معزز خاندان کے فرد تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم کاظم آباد میں ہوئی۔ اس کے بعد سرائے ترین سنبھل میں ویدک مذہب، وشاردا اور آریہ سماج سے متعلق مختلف امتحانات پاس کئے۔ اور سارا وقت مذہبی تعلیم حاصل کرنے میں لگا دیا۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ ۱۹۲۵ء میں

متھرا چلے گئے۔ جہاں تقریباً ۷ رسال مذہبی کاموں میں لگے رہے ۱۹۳۲ء میں سرائے ترین سنبھل واپس لوٹ آئے اور آخر تک یہیں رہے۔

مہاشیے پیارے لال کے دل میں حب الوطنی کا جذبہ تو بچپن سے ہی پرورش پانے لگا تھا اور جوانی آتے آتے اس جذبہ پر قابو نہ پا سکے اور غلامی کے خلاف تحریک میں سرگرم عمل ہو گئے۔ جب مہاتما گاندھی نے برطانوی حکومت کے خلاف نمک قانون توڑنے کا فیصلہ لیا تو اس وقت پیارے لال جی تحصیل متھرا میں خزانچی کے عہدہ پر مامور تھے انھوں نے مہاتما گاندھی کے ذریعہ چلائی گئی تحریک میں حصّہ لینے کے لئے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور ستیہ گرہ تحریک میں شامل ہو گئے ان کے باہمت کارناموں سے انگریز ان کے خلاف ہو گئے اور اذیتیں دینے کا ارادہ کیا سب سے پہلے ان کو چار کوڑے مارنے کی سزا دی گئی۔ ان کے خلاف وارنٹ جاری کر دئے گئے لیکن وہ خفیہ طور سے کام کرتے رہے اور پولس کے ہاتھ نہیں آئے۔

حصول آزادی کے بعد پیارے لال نے کانگریس سے جڑے رہ کر ملک کی خدمات انجام دیں۔ آریہ سماج اور کانگریس کے سکریڑی کے عہدہ پر کئی مرتبہ منتخب کئے گئے اور سماجی کاموں میں دلچسپی لیتے رہے جب پنڈت جواہر لال نہرو سرائے ترین آئے تو انھوں نے نہرو جی کا پر جوش استقبال کیا۔ مہاشیے پیارے لال گرفتار نہ ہو سکنے کی وجہ سے جیل جانے کی خوش نصیبی تو حاصل نہ کر سکے لیکن تحریک آزادی میں ان کی خدمات وطن پرستوں کے لئے ہمیشہ ہمّت افزائی کرتی رہیں گی۔

۲۲ ردسمبر ۱۹۸۶ء کو تقریباً ۸۵ رسال کی عمر میں یہ بہادر سپوت اس دنیا کو چھوڑ کر چلا گیا۔

حکیم مولوی عبید اللہ

سنبھل کے مجاہدین حریت میں حکیم عبید اللہ سنبھلی اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔ موصوف ایک اعلیٰ خاندان کے فرد، اعلیٰ پایہ کے عالم اور مشہور طبیب حاذق ہونے کے ساتھ ساتھ فعال مجاہد آزادی تھے۔انھوں نے ملک وقوم کی جو خدمات انجام دیں ان پر جتنا ناز کیا جائے کم ہے، مگر اس ستم ظریفی کو کیا کہا جائے کہ حصول آزادی کے بعد دیگر اکابر علماء، سرفروشان وطن اور مجاہدین حریت کی طرح ان کی حیات وخدمات بھی پردۂ خفا میں رہ گئیں چنانچہ نئی نسل ان کے کارناموں سے لاعلم اور ان کی قربانیوں سے ناواقف ہے۔

عبید اللہ سنبھلی ۱۹۰۸ء میں دیپا سرائے سنبھل کے ایک ذی علم اور ذی حیثیت خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ان کے والد ماجد حکیم محمد ایوب (متوفی ۱۹۴۶ء) اپنے عہد کے مشہور طبیب اور معروف عالم تھے۔ابتدائی تعلیم ذہین وذکی باپ کے سایہء عاطفت

میں حاصل کی بعد ازاں بارہ تیرہ سال کی عمر میں مدرسہ میں داخل ہوئے جہاں عبیداللہ نے مکتبی و دینی تعلیمات کے حصول کے ساتھ ساتھ، آزادی وطن کے لئے جہاد کرنے اور اپنا سب کچھ لٹا دینے کا درس بھی لیا۔ ایک طرف اپنے اکابر اساتذہ کے فیض صحبت سے وہ علمی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں مصروف تھے تو دوسری جانب برطانوی سامراج سے نجات حاصل کرنے کا جذبہ انھیں میدانِ کارزار میں کود پڑنے پر اکسار ہا تھا۔ چنانچہ جب تحریک خلافت پر شباب آیا اور ہر وطن دوست اس میں شامل ہو کر انگریزوں کے خلاف صف آرا ہونے کو اپنی سعادت سمجھنے لگا تو نوجوان عبیداللہ سنبھلی بھی پیچھے نہ رہے وہ نہ صرف تحریک خلافت کے نہایت سرگرم و متحرک کارکن کی حیثیت سے میدان میں آئے بلکہ اپنی انگریز دشمن سرگرمیوں کی وجہ سے سب کی نگاہوں کا مرکز بن گئے۔ انگریز حکمراں ان کی سرگرمیوں کو کیسے برداشت کر سکتے تھے انھوں نے مولانا کو گرفتار کر کے ملتان جیل بھیج دیا مجاہد ملت مولانا حسین احمد مدنی بھی رفیق سفر تھے۔ جیل میں مولانا عبیداللہ کو بڑی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ انھیں سخت مشقت پر مجبور کیا گیا طرح طرح کی اذیت ناک سزائیں دی گئیں اور ایسا سلوک روا رکھا گیا جن کا تصور کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن اس وحشیانہ سلوک اور ظالمانہ رویہ پر بھی مولانا کے پائے استقامت ڈگمگائے نہیں وہ اپنے نصب العین پر ثابت قدمی کے ساتھ قائم رہے۔

دو سال کی قید با مشقت کے اذیت ناک حالات سے نبرد آزما رہنے بعد کے ۱۹۲۴ء میں رہائی نصیب ہوئی۔ رہا ہونے کے بعد مولانا نے تکمیل تعلیم کی طرف توجہ دی اور دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا ۱۹۳۰ء میں تکمیل تعلیم کے بعد آبائی پیشے طب اور حکمت کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے لکھنؤ پہنچے۔ طب سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وطن

مالوف واپس آ گئے۔لیکن زیادہ دن قیام نہ کر سکے اور فطری رجحان غالب آیا۔اس وقت کے مشہور عالم مولانا عبدالشکور فاروقی کی خدمت میں حاضری دی اور اکتساب علم کیا لیکن غلامی کے شکنجے سے نجات پانے کے لئے برسر پیکار رہنے کی فطری خواہش کو دبا نہ سکے اور دین کی خدمت کے ساتھ ساتھ خدمت وطن بھی مقصد حیات رہی جو زندگی کی آخری سانس تک قائم رہا۔

۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو وطن غلامی کے شکنجے سے نجات پا گیا۔ناموس وطن کی خاطر ہر طرح کی قربانی دینے والا یہ مجاہد آزادی، آزاد ہندوستان میں زیادہ مدّت تک زندہ نہ رہ سکا اور ۱۲/اپریل ۱۹۵۲ء کو قید حیات سے آزاد ہو گیا۔

آئینۂ حیات مصنّف

نام: سعادت علی صدیقی

ولدیت: ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

تاریخ پیدائش: ۱۵؍مارچ ۱۹۴۵ء بروز جمعرات بمقام: لکھنؤ

وفات: ۱۴؍فروری ۱۹۹۴ء لکھنؤ

تعلیم

ہائی اسکول: ممتاز ہائر سکنڈری اسکول لکھنؤ (سیکنڈ ڈویژن)	۱۹۵۸
انٹرمیڈیٹ: اسلامیہ انٹر کالج لکھنؤ (سیکنڈ ڈویژن)	۱۹۶۱
بی۔اے: لکھنؤ یونی ورسٹی لکھنؤ (فرسٹ ڈویژن)	۱۹۶۳
آنرز: لکھنؤ یونی ورسٹی لکھنؤ (فرسٹ ڈویژن)	۱۹۶۴
ایم۔اے (اردو) لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ (فرسٹ پوزیشن)	۱۹۶۵
ایم لٹ (ریسرچ ڈگری کورس) دلی یونی ورسٹی (فرسٹ ڈویژن)	۱۹۶۸
پی۔ایچ۔ڈی لکھنؤ یونی ورسٹی اوارڈ	۱۹۸۳
ڈی لٹ (سنبھل میں اردو ادب کا ارتقا) غیر مکمل رجسٹریشن	۱۹۹۲

اعزازات وانعامات

لکھنؤ یونی ورسٹی اسکالرشپ (بی اے)	۱۹۶۲
لکھنؤ یونی ورسٹی میرٹ اسکالرشپ (ایم اے)	۱۹۶۴
لکھنؤ یونی ورسٹی میرٹ گولڈ میڈل (ایم اے)	۱۹۶۵

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اسکالرشپ	۱۹۶۶
اتر پردیش اردو اکیڈمی سے حبسیہ غالب پر انعام	۱۹۷۱
اتر پردیش اردو اکیڈمی سے ادبی جائزے پر انعام	۱۹۷۴
اتر پردیش اردو اکیڈمی سے ادبی آئینے پر انعام	۱۹۸۳
اتر پردیش اردو اکیڈمی سے ادبی تحریریں پر انعام	۱۹۹۰
فروغ اردو لکھنو رکن مجلس ادارت	۱۹۷۱
چیئرمین اتر پردیش اردو تعلیمی جائزہ کمیٹی	۱۹۷۴
انجمن ترقی اردو شاخ سنبھل کے جنرل سکریٹری	۱۹۷۴
اتر پردیش تعلیمی مشاورتی بورڈ کی سہ رکنی کمیٹی کے رکن	۱۹۸۵
ریاستی حکومت کے گورنر کی جانب سے نام زدگی بحیثیت ضلع جیل وزیٹر	۱۹۷۶
عاشق پبلک لائبریری کے صدر	۱۹۷۶
اردو تنظیموں کی جانب سے (محسن اردو ایوارڈ)	۱۹۸۲
کل ہند اردو سماج لکھنو کی جانب سے گولڈ میڈل	۱۹۸۳
اتر پردیس اردو اکیڈمی کی جانب سے علاقائی کانفرنس میں محسن اردو ایوارڈ	۱۹۸۳
فرخ میموریل ایوارڈ	۱۹۸۸
اتر پردیش اردو اکیڈمی کے رکن	۱۹۹۲
اتر پردیش اردو اکیڈمی کے اسکالرشپ سب کمیٹی کے رکن	۱۹۹۳
مسلم گریجویٹ فورم آف انڈیا کی توصیفی سند	۱۹۹۳
امتیاز میر ایوارڈ لکھنو	۱۹۹۳

کامل میموریل سوسائٹی کی جانب سے توصیفی سند ۱۹۹۳

ترنگ کی جانب سے توصیفی سند ۱۹۹۳

اردو اکیڈمی سے پس از مرگ ۱۰ ہزار روپیہ کا انعام ۱۹۹۴

ملازمت

تقرر بحیثیت مارکیٹنگ انسپکٹر ہلدوانی ضلع نینی تال ۱۹۶۵

تقرر بحیثیت عارضی لکچرر شعبہ اردو دلی یونیورسٹی ۱۹۷۰

تقرر بحیثیت لکچرر مہاتما گاندھی کالج سنبھل روہیل کھنڈ یونیورسٹی ۱۹۷۱

مطبوعات

(۱) آئینۂ نثر اردو (۱۹۶۵ سے متعدد یونیورسٹیوں میں شامل) ۱۹۶۵

(۲) بچوں کی لوک کہانیاں ۱۹۷۰

(۳) شرح ادب پارے نثر (برائے انٹر) ۱۹۶۶

(۴) حبسیۂ غالب (غالب کی جیل کی زندگی مع حبسیئہ) ۱۹۷۱

(۵) ادبی جائزے (مجموعہ مضامین ریڈیائی تقاریر) ۱۹۷۵

(۶) وہ جب یاد آئے ۱۹۸۲

(۷) حدیث محبت (انتخاب کلام فرخ نگینوی) ۱۹۸۳

(۸) ادبی آئینے (مجموعہ مضامین) ریڈیائی تقاریر ۱۹۸۳

(۹) چند ممتاز شعرائے سنبھل (حصہ اوّل) ۱۹۸۳

(۱۰) ادبی تحریریں ۱۹۸۹

(۱۱) غالب پر چند تحریریں ۱۹۹۰

(۱۲) اردو کا زندانی ادب ۱۹۹۰

(۱۳) سنبھل کے چند اکابر علماء و مجاہدین آزادی ۱۹۹۰

(۱۴) چاند میں خرگوش ۱۹۹۳

(۱۵) ادبی تنویریں (سلمیٰ خاتون) ۱۹۹۶

(۱۶) اردو کا دھرم نرپیکش سروپ (رضوان فاروقی) ۱۹۹۶

(۱۷) انتخاب کلام قمر مرادآبادی (اردو اکاڈمی) ۲۰۰۵

(۱۸) پریم چند نمبر ۱۹۷۸

(۱۹) سنبھل کے ممتاز مجاہدین آزادی (ڈاکٹر محمد ریاض حمیدی) ۲۰۱۰

زیر طبع کتب

(۱) چار ممتاز شعرائے سنبھل (مذہبیات)

(۲) انتخاب کلام باغ سنبھلی

(۳) انتخاب کلام شوق فریدی

(۴) سنبھل کے اکابر علماء

مسودات

(۱) چند ممتاز شعرائے سنبھل جلد دوم (۲) چند ممتاز شعرائے سنبھل جلد سوم (۳) ادبی شخصیات سے انٹرویو (۴) یہ بستیاں ہماریاں (۵) یہ پراگندہ طبع لوگ (۶) ادبی تبصرے (۷) رامائن مسدس (۸) بچوں کی کہانیاں (۹) ادبی مضامین (۱۰) سنبھل کی ادبی خدمات (۱۱) رہنمائے اردو

سوانحی خاکہ (مرتّب)

نام : محمد ریاض الاسلام

ولدیت : جناب شیخ محمد نذر (ترک)

تاریخ پیدائش : ۱۰راپریل ۱۹۶۹ء (دیپاسرائے سنبھل)

ادبی شناخت : ڈاکٹر ریاض حمیدی

سکونت : مسکن اردو ہندو پورہ کھیڑا، دیپاسرائے، سنبھل

تعلیم

بی اے فرسٹ ڈویژن۔ایم۔اے اردو فرسٹ ڈویژن

بی ایڈ. معلّم اردو. آئی. جی. ڈی. ممبئی. پی. ایچ. ڈی. روہیلکھنڈ یونیورسٹی

پیشہ

درس وتدریس

مشاغل

خدمت اردو، خدمت خلق۔

چیرمین اتر پردیش اردو تعلیمی جائزہ کمیٹی۔

سکریٹری: ڈاکٹر سعادت علی صدیقی میموریل اردو اکیڈمی، سنبھل۔

تصنیف و تالیف

ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کی علمی اور ادبی خدمات (تحقیقی مقالہ) انعام یافتہ

تنویر اردو ۲۰۰۴ء

گلزار ادب ۲۰۰۵ء

ریاض اردو ۲۰۰۵ء

ثوبان اردو ریڈر ۲۰۰۶ء

سنبھل کے ممتاز مجاہدین آزادی ۲۰۱۰ء

سنبھل کے مدرس شعراء (تذکرہ)

فرہنگ دبیر (زیر ترتیب)

انعامات و اعزازات

ایوارڈ آف آنر..................................ایم.جی۔ایم ڈگری کالج، سنبھل

سرسیّد ایوارڈ..................................ایجوکیشنل سوسائٹی، مراد آباد

ایوارڈ آف آنر..................................ہویٹ مسلم انٹر کالج، مراد آباد

شیروانی ایوارڈ..................................بھارت سیوا ٹرسٹ، دہلی

بانی

سعادت علی صدیقی میموریل اسکول سنبھل

تحریک فیضان لوح و قلم: محمد ساجد رضا قادری رضوی